www.urducouncil.nic.in

اگست 2017، قیمت:- /10₹

ماهنامه

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
اُردو دُنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی
فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد:5 شمارہ:8 اگست 2017

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر :ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000

شعبہ ادارت:11-49539009

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10روپے، سالانہ/100روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتے پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی-110066

فون:26109746

ای میل:sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون:040-24415194

اس شمارے میں

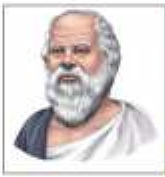

مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05
جشنِ آزادی	بھکائی جی کاما	اقبال مہدی زیدی	06
	آؤ بچو! عہد کریں	نذیر فتح پوری	09
	رکھو ترنگے کو بلند	سمیع احمد صدیقی	10
	قصۂ ہندوستاں	احمد امام	11
	روشن رہے ہمیشہ	سعدیہ صدف	12
مضامین	ایوریسٹ حوصلہ رکھنے والی شیخ	رحمن اکولوی	13
	صدارتی انتخاب	ریحان کوثر	15
ڈراما	سقراط	مظہرالاسلام	20
نظمیں	میرا دیش ہے سب سے نیارا	راشد جمال فاروقی	23
	بدلاؤ آئے گا	حبیب سیفی	23
سیر ہن	کولکاتا کے سائنسی شہر کی سیر	محمد خلیل	24
کہانیاں	بھلا بتائیے تو!	کنہیالال کپور	27
	چالاک مصور	رونق جمال	30
	محنت رائیگاں نہیں جاتی	سید لطف اللہ گورکھپوری	32
کھیل اور کھلاڑی	پہلے ہی یک روزہ میچ میں سنچری	سید پرویز قیصر	36
باتصویر کہانی	ایک دکھ بھری کہانی	اقبال برکی	39
قسط وار ناول	زمین کی تہہ میں	شکیل صدیقی	43
کہکشاں	بڑے لوگ بڑی باتیں		50
	ابن الہیثم : بابائے جدید بصریات	جنید عبدالقیوم شیخ	53
	اقوال زریں	رونق بی ملک ستار	54
	اقوال زریں	شمائلہ ارم محمد اعجاز	54
	آؤ اردو سیکھیں		55
ننھے فنکار	رسی کے نشان	ندا پروین محمد انیس	57
	جادوئی گھڑا	عمرہ تجاروی	58
	ہنسی کے غبارے		59
	بچوں کی پینٹنگ		60
آپ کی باتیں	اردو فیس بک		62

آپس کی باتیں

پیارے دوستو! 15 اگست ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اسی تاریخ کو ہمیں آزادی ملی اور ہم انگریزوں کے ظلم وستم سے آزاد ہوئے۔ یہ آزادی ہمیں آسانی سے حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اس کے لیے ملک کے جیالوں کو مصیبتوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس سال ہم لوگ ملک کا 71 واں جشن آزادی منا رہے ہیں۔ ان 71 برسوں میں ہمارے ملک نے ہر شعبے میں نمایاں ترقی کی ہے اور ہم آج مختلف شعبوں میں دنیا کے لیے ایک مثال بنے ہوئے ہیں۔ تعلیم، سائنس، زراعت، ٹکنالوجی اور خلائی پیش رفت میں ہم دنیا کے کئی اہم ممالک سے آگے ہیں۔ ہندوستان میں شروع سے مختلف زبانوں، مذاہب، رسوم ورواج کے ماننے اور جاننے والے رہتے ہیں۔ تہذیب وثقافت کی یہی رنگارنگی ہمارے ملک کو دلکشی عطا کرتی ہے۔

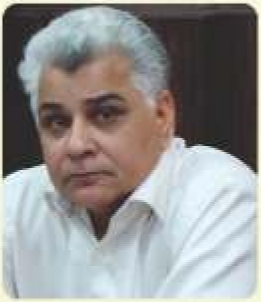

بچو! 70 سال کے طویل عرصے میں ہم نے ترقی ضرور کی ہے مگر اب بھی کچھ خواب ہیں جو ادھورے ہیں۔ ہمیں ان خوابوں کو پورا کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ہر گھر اور ہر بچے کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا ہے۔ ہر چہرے پر مسکان دیکھنی ہے۔ سماج کو مفلسی سے چھٹکارا دلانا ہے۔

گندگی، بیماری، غریبی، آپسی لڑائی جھگڑے، معیاری تعلیم کا فقدان جیسے مسئلے ہمارے سامنے ہیں جن سے ہم سب کو مل کر نمٹنا ہے۔ حکومت اپنی سطح پر کوششیں کر رہی ہے لیکن ہندوستان کے ہر فرد کو ان مسائل کے حل کے لیے دھیان دینے کی ضرورت ہے، خاص طور پر صفائی ہمارے لیے بہت اہم مسئلہ ہے۔ آپ سب بھی اپنے آس پاس صفائی پر دھیان دیں۔ کوئی غریب بچہ اگر اسکول نہیں جا رہا ہے، تو اسے اسکول بھیجنے میں مدد کریں، دیگر مذاہب کے بچوں کے ساتھ محبت سے پیش آئیں۔ تعلیم کو اپنا نصب العین بنائیں اور دل لگا کر پڑھائی کریں۔ آپ ہی ملک کے مستقبل ہیں اور آپ میں سے ہی کوئی سائنس داں، کوئی انجینئر تو کوئی ڈاکٹر بنے گا۔ آپ جس میدان میں بھی جائیں ملک اور ملک کی عوام کی خدمت کا جذبہ آپ کے اندر ضرور ہونا چاہیے اور یہی جذبہ ہمارے ملک کو بہتر سے بہتر بنانے میں معاون ثابت ہوگا۔ آپ سب خوش قسمت ہیں کہ ایک ترقی یافتہ ہندوستان کی فضا میں سانس لے رہے ہیں اور جدید تکنیکی سہولیات اور ترقیات سے فیض اٹھا رہے ہیں۔ ذرا آزادی کے قبل کے ہندوستان کا تصور کریں۔ اس دور کے بچوں کے بارے میں سوچیں۔ آج کے دور کی سہولیات انھیں میسر نہیں تھیں پھر بھی انھوں نے اپنی اپنی سطح پر کامیابی حاصل کی۔ آپ سب بھی ہندوستانی تاریخ کے موضوعات پر مبنی کتابیں ضرور پڑھیں تاکہ مستقبل کو روشن بنانے میں مدد مل سکے۔

'بچوں کی دنیا' کے تازہ شمارے میں آزادی سے متعلق تحریریں بھی آپ پڑھیں گے۔ ان کے علاوہ اچھی اچھی کہانیاں اور نظمیں تو ہیں ہی۔ اپنے مشوروں اور تاثرات سے آگاہ کرنا نہ بھولیں۔ آپ سبھی کو یومِ آزادی کی دلی مبارکباد!

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈاک خانہ

'بچوں کی دنیا' جون کا تازہ شمارہ ہاتھ میں ہے۔ ماحولیات کی اہمیت پر آپ کا اداریہ بہت پسند آیا۔ ایم ایم شیخ کا خط بڑا مختصر تھا۔ عید سے پہلے عید پر نظم کا کیا مطلب۔ بعض مضامین جو سائنسی ہیں اسے اور آسان بنا کر ترجمہ کرانا چاہیے۔ نور صاحب کی تندرستی کے عنوان سے نظم بہت بہتر ہے۔

* بچوں کی دنیا ایک مہینہ پہلے چھپتا ہے۔ عید چونکہ جون کے مہینہ میں ہے اس لیے اس شمارے میں عید پر نظم دی گئی تھی۔ (ادارہ)

انصار احمد معروفی، بلوہ کورتھی جعفر پور، مئو، یوپی

مئی کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی دل خوش ہوگیا۔ اس لیے کہ مجھے آم بہت پسند ہے۔ سب سے پہلے میں نے امتیاز انصاری کا مضمون 'پھلوں کا راجہ آم' پڑھا' بہت اچھا لگا لیکن انھوں نے ایک مشہور آم کا ذکر نہیں کیا ہے وہ ہے مالدہ آم جو بہار میں خوب پھلتا ہے اور کافی لذیذ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ 'شیر کی درگت' اور دیگر سارے مضامین کافی پسند آئے۔

شمشیر احمد، پھلواری شریف، پٹنہ، بہار

'بچوں کی دنیا' کا ہر شمارہ بہت عمدہ ہے۔ دیدہ زیب صفحات اور تصاویر ہیں۔ کہانیاں، نظمیں اور مضامین معیاری ہیں۔

محمد اشرف، سی پی زرین شبنم پارل، توتا، ملاپرم، کیرالا

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کا فروری کا رسالہ بہت پسند آیا جس میں لال قلعہ کی معلومات ہے۔ ہمارے جنرل نالج میں اضافہ ہوا اور ایک بچے کی 'تصوراتی دنیا' نظم اچھی لگی۔

محمد ثاقب محمد عارف، صوفی چوک، باڑے گاؤں، اکولہ (مہاراشٹر)

سب سے پہلے میں آپ کو بچوں کے اتنے خوبصورت رسالے کی اشاعت کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اسے صرف بچے ہی نہیں بڑے بھی پسند کرتے ہیں۔ میں اس کا مستقل خریدار ہوں۔ میرے بچوں کے علاوہ محلے پڑوس اور گھر کے دیگر بچوں کو اس کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔

ذکی انور، محلہ مانپور گوئل نگر کے پیچھے، جگن مالی کا باغ، مراد آباد یوپی

ہر ماہ 'بچوں کی دنیا' ہاتھ میں آتے ہی دل خوش ہوجاتا ہے۔ 'بچوں کی دنیا' کے رنگین صفحات، اور آپ کی محنتیں واقعی تعریف کے قابل ہیں۔

قمرالدین معین الدین شیخ، نیو خواجہ نگر، ہڑکو پیرالہ، جلگاؤں، مہاراشٹر

اقبال مہدی زیدی

بھکائی جی کاما

جب ہم اپنے قومی پرچم کو لہراتا دیکھتے ہیں تو ہم اپنے اندر حب الوطنی کا ایک جوش سا اور ایک قوم کی حیثیت سے اپنے آپ پر فخر سا محسوس کرتے ہیں۔

اس کے پیچھے جو تاریخ ہے کیا ہمیں کبھی اس کا بھی خیال آتا ہے؟

ہم سب جانتے ہیں کہ ہندوستان 1947 میں ایک آزاد ملک بنا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک لمبی اور کڑی جدوجہد کے بعد ہمیں آزادی اور اس جھنڈے کو لہرانے کا حق ملا جو ہماری قومیت کا سب سے اہم نشان ہے۔ لیکن ہم میں سے کتنے اس دلیر خاتون کے بارے میں کچھ جانتے ہیں جس نے پہل کر کے اس پرچم کو اول بار لہرایا تھا؟

اس خاتون کا نام 'بھکائی جی کاما' تھا اور 1907 وہ سال تھا جب ہمارا قومی پرچم —اب سے تھوڑی بدلی ہوئی شکل میں— لہرایا گیا تھا۔ مقام تھا اسٹٹگارٹ، جرمنی میں جہاں بین الاقوامی سوشلسٹ کانگریس کا ایک اجلاس ہو رہا تھا۔

آزادی کی جدوجہد کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے ابھی ایک لمبا راستہ طے کرنا تھا۔ پرچم لہرا دینے کے اس دلیرانہ کام نے نہ صرف دنیا کے ملکوں کی توجہ، ایک محکوم ملک کی حیثیت سے ہندوستان کی طرف موڑ دی بلکہ آزادی کی لڑائی لڑنے والوں کو ایک ایسا نشان بھی دے دیا جس کے نیچے اکٹھے ہو کر وہ لڑ سکیں۔ جیسا کہ گاندھی جی نے بعد میں کہا، ”ہر قوم کے لیے ایک پرچم ضروری ہے۔ لاکھوں انسانوں نے اس کے لیے جانیں دی ہیں کیونکہ پرچم ایک تصور کو ظاہر کرتا ہے۔ ہم ہندوستانیوں کے لیے بھی یہ ضروری ہوگا — ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں، پارسیوں اور ان سب لوگوں کے لیے جو ہندوستان کو اپنا گھر سمجھتے ہیں کہ وہ ایک ہی پرچم کو اپنا مان لیں، اسی کے لیے جئیں اور مریں۔“ پنڈت نہرو نے کہا، ”مجھے یاد ہے اور بہت سوں کو یاد ہوگا کہ جب جب یہ ترنگا جھنڈا نظر آتا تو ہم کیسا فخر اور جوش سا محسوس کرتے۔ ہماری رگوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگتی اور بعض مرتبہ جب ہم نڈھال اور مایوس ہوتے تو اس پرچم کا نظارا ہم میں آگے بڑھنے کی ہمت پیدا کر دیتا۔“

'میڈم کاما' جن کو اکثر 'ہندوستان کے انقلاب کی ماں' کہا جاتا تھا 24 ستمبر 1861 کو بمبئی میں ایک مالدار پارسی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ 'سراب جی، فرام جی پٹیل'، ان کے والد اور 'جیجی بائی' ان کی ماں تھیں۔ ان کے والد بہت ہی مالدار تھے کیونکہ انھوں نے اپنے ہر بیٹے کے لیے تیرہ، تیرہ لاکھ روپے چھوڑے اور اپنی آٹھوں بیٹیوں میں سے ہر ایک کے لیے ایک ایک لاکھ روپے وقف کیے۔

اس زمانے میں کچھ ہی لڑکیاں باقاعدہ تعلیم حاصل کرتی

تھیں۔ دراصل ان میں سے زیادہ تر لکھنا پڑھنا کم ہی سیکھتی تھیں۔ لیکن پارسی ترقی پسند لوگ تھے۔ اس لیے بھکائی جی کو جو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ممکن تھی وہ ملی۔ انھوں نے ممبئی کے الیگزینڈر گرلس اسکول میں پڑھا اور بہت سی ہندوستانی اور غیر ملکی زبانیں بھی فرفر بولنی سیکھ لیں۔

ہندوستانی تاریخ کا یہ ایک ہنگامی دور تھا۔ 1857 کی بغاوت کو کچلنے میں اگرچہ انگریز کامیاب ہوگئے تھے لیکن ہندوستان کی آزادی کا سوال اب بھی باقی اور زندہ تھا۔ آزادی کا مفہوم وسیع اور گہرا ہوتا جارہا تھا اور اس کے لیے الگ الگ راستے سوچے جارہے تھے۔ جیسے جیسے برطانوی راج کی سختیاں بڑھتی گئیں، ہندوستان کے لوگوں کی بے اطمینانی بھی بڑھنے لگی۔ آزادی کے لیے لڑنے والوں کا ایک نیا طبقہ میدان میں اتر آیا۔ یہ درمیانی طبقے کے تعلیم یافتہ لوگ تھے جن پر مغربی خیالات کا اثر تھا۔

1885 ان کے لیے اہم سال تھا۔ اس سال ان کی شادی 'رستم جی کاما' سے ہوئی جو ایک بیرسٹر تھے اور بمبئی کے سب سے زیادہ جانے پہچانے خاندانوں میں سے ایک کے فرد تھے۔ وہ ایک مشہور پارسی مصلح (اصلاح چاہنے والے) اور عالم، کے۔ آر۔ کاما کے بیٹے تھے۔

کانگریس کا جنم

1885 میں ہی 'انڈین نیشنل کانگریس' کا پہلا اجلاس ہوا۔ 'بھکائی جی' اس واقعے سے متاثر اور بہت ہی خوش تھیں۔ وہ اپنے ملک کو غیر ملکی جوئے سے آزاد دیکھنے کی مشتاق تھیں۔ ان کی دوربین نظر انھیں دکھارہی تھی کہ ملک کی آزادی کے لیے مردوں کے ساتھ کام کرنے سے عورتوں کو اپنی بے بسی سے نجات حاصل کرنے کا ایک موقع ملے گا۔

سماج کے سب سے زیادہ مالدار طبقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بھکائی جی اپنا وقت سماجی تفریحات میں بھی گزار سکتی تھیں لیکن انھوں نے اپنے آپ کو پبلک کے کاموں میں لگائے رکھا۔ 1896 میں بمبئی میں پلیگ (طاعون) کی وبا پھیلنے کے زمانے میں انھوں نے اپنی سماجی خدمت کی زندگی کی شروعات کی۔ اس زمانے میں کسی مالدار خاتون کو پبلک اسپتال میں مریضوں کی دیکھ بھال کرتے کسی نے سنا بھی نہیں تھا۔ لیکن بھکائی جی باہمت تھیں۔ اُنھوں نے رواج اور دستور پر ان باتوں کو ترجیح دی جنھیں وہ ٹھیک سمجھتی تھیں۔

بھکائی جی کے سیاسی خیالات سے ان کے شوہر اتفاق نہیں کرتے تھے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی یہ مانتے تھے کہ برطانوی راج ہندوستان کو فائدہ پہنچانے والا ہے۔ اس بات پر اکثر ان میں شدید اختلاف بھی ہوجاتا تھا۔ آخر انھوں نے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کرلی۔ ملک کی بھلائی سے ان کی وفاداری اتنی گہری تھی کہ اپنی شادی شدہ زندگی کو بچانے کے لیے بھی وہ اس کو نہ چھوڑ سکیں۔

1902 میں بھکائی جی اپنے علاج کی غرض سے لندن گئیں۔ یہاں ان کی زندگی کا ایک اہم دور شروع ہوا۔ ان کی ملاقات ہندوستان کے عظیم مرد بزرگ، 'دادابھائی نوروجی' سے ہوئی۔ جن کے ساتھ انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے لیے کام کرنا شروع کردیا۔ وہ ان عظیم آدمیوں میں سے تھے جنھوں نے بھکائی جی کو متاثر کیا۔

اگست 1907 میں انھوں نے اپنی عملی زندگی کا سب سے زیادہ اہم کارنامہ انجام دیا۔ قومی پرچم لہرایا۔ سردار سنگھ رانا کے ساتھ وہ اسٹٹگارٹ (جرمنی) میں ہونے والی انٹرنیشنل سوشلسٹ کانگریس میں شامل ہوئیں۔ یورپ، ایشیا، امریکہ

اور افریقہ کے پچیس ملکوں کے نمائندوں کے سامنے انھوں نے ہندوستان کو آزادی دلانے کی کوششوں میں مدد کے لیے بہت جوشیلی تقریر کی اور تقریر کے خاتمے پر نہایت ڈرامائی انداز میں ایک پرچم لہرا دیا۔ ہرے، پیلے اور لال رنگوں والا یہ ترنگا پرچم تھا جس کی بیچ کی پٹی پر 'وندے ماترم' لکھا تھا۔

اس واقعے کا بہت اثر ہوا اور جرمن زبان کے اخبار 'ڈلیپز گرزیٹنگ' اور دوسرے اخباروں میں اس کی خبر شائع ہوئی۔ بعد میں محبِ وطن انقلابیوں کے دوسرے ریکارڈ کے ساتھ اس جھنڈے کو بھی 'اندولال یاجنک' چوری چھپے ہندوستان لے آئے اور اب وہ پونا میں 'کیسری' اور 'مرہٹہ' کے لائبریری ہال میں رکھا ہوا ہے۔

اس پرچم کو میڈم کاما اور ساور کرنے ساتھ ساتھ تیار کیا تھا۔ ہرا رنگ مسلمانوں کے لیے متبرک تھا۔ سنہرا یا پیلا، بدھوں اور سکھوں دونوں کے لیے متبرک تھا اور لال ہندوؤں کے لیے۔ اس میں آٹھ ستارے بھی دکھائے گئے تھے جو ہندوستان کے آٹھ صوبوں کو ظاہر کرتے تھے اور بڑی بڑی ان قومیتوں کی علامتیں تھیں جو سب ہندوستان میں مل جل کر رہتی تھیں۔

انٹرنیشنل سوشلسٹ کانفرنس کے بعد میڈم کاما نے یو۔ایس۔اے کا بہت کامیاب دورہ کیا۔ وہاں انھوں نے بہت سے جلسوں میں تقریریں کیں جس میں انھوں نے بتایا کہ انگریزوں نے کس طرح ہندوستان کو دبا کر رکھا ہوا ہے۔ اگرچہ وہ کوئی بہت زوردار مقرر نہیں تھیں لیکن ان کے خلوص اور جوش نے سب کو بہت متاثر کیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ خاموش مزاحمت کا تصور جسے گاندھی جی بہت کامیابی کے ساتھ کام میں لائے، پہلے میڈم کاما ہی نے پیش کیا تھا۔ ایک اخباری نامہ نگار کے یہ پوچھنے پر کہ ہندوستان سے انگریزوں کو نکالا کس طرح جائے گا؟ انھوں نے کہا تھا ''خاموش مزاحمت کے ذریعے۔ ہم امن پسند لوگ ہیں، اور نہتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں بھی تو اٹھ کر لڑ نہیں سکتے۔ ہم اپنے لوگوں کو کارگر مزاحمت کے لیے تیار کر رہے ہیں، بس ضرورت اتحاد اور تنظیم کی ہے۔''

پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ اور فرانس مل کر لڑے تھے۔ اس لیے اس زمانے میں مسز کاما کو تین سال کے لیے نظربند بھی رہنا پڑا۔ فرانس کی حکومت اگرچہ ان کے ساتھ ہمدردی کا رویہ رکھتی تھی لیکن ان کی صحت جو ہمیشہ خراب ہی رہتی تھی اور زیادہ خراب ہوگئی۔ انھیں یہ بھی لکھ کر دینا پڑا کہ اس عرصے میں وہ اپنی انقلابی کارروائیوں سے باز رہیں گی۔

محترمہ کاما پیرس میں تقریباً تیس سال رہیں۔ عالمی جنگ کے بعد ان کی صحت بہت خراب رہنے لگی۔ لیکن اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ برابر کام کرتی رہیں اور اپنی زندگی میں اپنے وطن کو آزاد دیکھنے کی امید انھیں آخر دم تک رہی۔

پچہتر سال کی عمر میں، جب وہ اتنی بوڑھی ہو چکی تھیں کہ حکومت کو ان سے کوئی حقیقی خطرہ نہ رہا تب انھیں ہندوستان واپس آنے کی اجازت ملی لیکن یہ بھی اس تحریر پر دستخط کرنے کے بعد جس میں لکھا تھا کہ ہندوستان واپس جا کر وہ نہ کسی جلسے میں شرکت کریں گی اور نہ تقریر کریں گی اور اب تو وہ اس قابل بھی نہیں رہی تھیں کہ کچھ لکھ سکیں، چل سکیں یا کھڑی ہو سکیں۔

بہر طور چونتیس سال ملک بدر رہنے کے بعد وہ اپنے وطن کی سرزمین پر اتریں اور سیدھی پارسی اسپتال روانہ ہوگئیں۔

یہاں آٹھ مہینے ان کا علاج چلتا رہا۔ ان کے شوہر نے انھیں معاف نہیں کیا۔ ان کے بہت سے رشتہ داران سے کتراتے رہے۔ کچھ عزیز اور کچھ پرانے پارسی دوست ان سے ملنے ضرور آئے۔

آخر 16 اگست 1936 کو یہ دلیر خاتون دنیا سے سدھار گئیں۔

■

ماخوذ: یاد کیجیے ہمارے رہنما، **مصنفہ:** دیپا اگروال
مترجم: اقبال مہدی زیدی
ناشر: قومی اردو کونسل، چلڈرن بک ٹرسٹ
بچوں کا ادبی ٹرسٹ، مارچ 1999

نذیر فتح پوری

آؤ بچو! عہد کریں

ایسا دیش بنائیں گے
جس میں پیار بسائیں گے

بھید نہ ہوگا مذہب کا
فرق نہ ہوگا ملت کا
من چاہا سب گائیں گے
تال میں تال ملائیں گے
ایسا دیش بنائیں گے
جس میں پیار بسائیں گے

دھوپ میں سب کا حصہ ہو
چاند پہ سب کا قبضہ ہو
جگنو، تارے سب کے ہیں
تتلی بھنورے سب کے ہیں
سب مستی میں گائیں گے
ایسا دیش بنائیں گے

بلبل، مینا، مور سبھی
بھنورا، تتلی، کوئل بھی
گائے، بکری، بندر شیر
کتا، بلی، بھینس، بیڑ
من چاہا سب کھائیں گے
اپنی بھوک مٹائیں گے
ایسا دیش بنائیں گے
جس میں پیار بسائیں گے

ہنستا گاتا جیون ہو
مہکا مہکا گلشن ہو
ہر جانب ہریالی ہو
ہر جانب خوش حالی ہو
ایسا دیش بنائیں گے
جس میں پیار بسائیں گے

موسم ہنستا گاتا ہو
ساون دھوم مچاتا ہو
بادل جھوم کے آتا ہو
اور پانی برساتا ہو
ایسا دیش بنائیں گے
جس میں پیار بسائیں گے

ہر سپنا ہو نورانی
نیند ہو اپنی من مانی
جب چاہیں جب جاگ پڑیں
جب چاہیں جب سو جائیں
ایسا دیش بنائیں گے
جس میں پیار بسائیں گے

دھرتی سب کی دھرتی ہے
دھرتی سب سے کہتی ہے
میں ممتا کی ماری ہوں
اور بہت دکھیاری ہوں
ایسا دیش بنائیں گے
جس میں پیار بسائیں گے

Nazeer Fatehpuri
Post Box No.: 13, Yerwada
Pune - 411006 (MS)

سمیع احمد صدیقی

رکھو ترنگے کو بلند

مرے وطن کے نوجواں   تم ہو وطن کے پاسباں
تم سے وطن کی شان ہے   تم ہو وطن کے رازداں
اُٹھو چلو چلتے رہو
اے ہم وطن اے ساتھیو

بیٹھو نہ تھک کر ساتھیو   بڑھتے چلو بڑھتے چلو
دنیا کو کچھ دکھلا بھی دو   میرے بہادر رہبرو
اُٹھو چلو چلتے رہو
اے ہم وطن اے ساتھیو

آواز دیتا ہے گگن   تم ہو نگہبانِ وطن
رکھو ترنگے کو بلند   تم باندھ کر سر سے کفن
اُٹھو چلو چلتے رہو
اے ہم وطن اے ساتھیو

اِس زندگی میں کیا قیام   ہر ہر قدم ہو تیزگام
تم سے وطن کی آن بان   سُن لو یہ احمد کا پیام
اُٹھو چلو چلتے رہو
اے ہم وطن اے ساتھیو

Sami Ahmed Siddiqui
I-92, Rameshwarpur Road
Matia Burj
Kolkata - 24 (West Bengal)

قصۂ ہندوستاں

سنا ہے یہ ہم نے بڑوں کی زبانی
اس آزاد ہندوستاں کی کہانی
تھا عوام میں جذبۂ غمگساری
نمازی کا دشمن نہیں تھا پجاری

سنا ہے کہ تھا ہر طرف بھائی چارا
وطن مثلِ خلدِ بریں تھا ہمارا
غلط کو صحیح لوگ لکھتے نہیں تھے
قلمکار سکوں میں بکتے نہیں تھے

تھے ہندو مسلماں یہاں بھائی بھائی
نہ جھگڑا کہیں تھا نہ کوئی لڑائی
کھلے عام رشوت ستاتی نہیں تھی
غریبی میں بے اطمینانی نہیں تھی

محبت کا پھیلا ہوا تھا اجالا
تھا انسانیت کا بڑا بول بالا
خوشی تھی امن و اماں کی فضا تھی
ادب زندگی میں تھا شرم و حیا تھی

تعصب میں ڈوبی حکومت نہیں تھی
وزیروں کے دل میں خصومت نہیں تھی
بڑی دلکشی تھی ہمارے وطن میں
بہاریں تھی رقصاں ہمارے چمن میں

صد افسوس! وہ گلستاں اب نہیں ہے
وہ پہلا سا ہندوستاں اب نہیں ہے

■

Ahmad Imam
Chudi Mahel, Po.: Balapur - 444302
Distt.: Akola (Maharashtra)

سعدیہ صدف

روشن رہے ہمیشہ

دامانِ کہکشاں سا — ہر سر پہ سائباں سا
لگتا ہے دیش اپنا — دھرتی پہ آسماں سا
جس جس نے اس کو دیکھا — سب کا یہی ہے کہنا
ہندوستاں کے جیسا — کب کوئی دیش ٹھہرا
ملکوں میں خوب تر ہے — اک امن کا نگر ہے
ہندوستاں کی جانب — ہر ملک کی نظر ہے
دل اس کا گویا درپن — شفاف اس کا دامن
ہر قوم ہر زباں کے — لوگوں کا ہے یہ مسکن
ہر کوچہ و عمارت — دے دعوتِ سیاحت
شوقِ نظارا سے پھر — ہوتی سب کو حیرت
میلوں کی ہے یہ دھرتی — کھیلوں کی ہے یہ دھرتی
سارے مہاپرش کے — چیلوں کی ہے یہ دھرتی
چوکس ہی رہنا لالے — دشمن ہیں دل کے کالے
ہم دیش واسیوں میں — کوئی نہ پھوٹ ڈالے

لے لو قسم خدا کی
حسرت ہے سعدیہ کی
روشن رہے ہمیشہ
یہ شمع ایکتا کی

■

Sadia Sadaf
67, Maulana Shaukat Ali Street
(Colootola St.) Kolkata - 700073 (WB)

شیخ رحمن اکولوی

ایوریسٹ حوصلہ رکھنے والی

وہ 12 اپریل 2011 کی رات میں پدماوتی ایکسپریس سے لکھنؤ سے دہلی جا رہی تھی کہ دو بجے کے قریب کچھ لوگ اس کے کمپارٹمنٹ میں آئے اور اس کا بیگ اور سونے کی چین چھیننے کی کوشش کرنے لگے۔ اس نے ان کا ڈٹ کر سامنا کیا۔ جب ان لوگوں کا بس نہ چلا تو انھوں نے اسے بریلی کے قریب چلتی ٹرین سے نیچے پھینک دیا۔ اس سے اس کا بایاں پیر گھٹنے تک کٹ گیا اور دائیں پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ لگ بھگ سات گھنٹے بیہوش پڑی رہی۔ اس دوران 50-55 ٹرینیں وہاں سے گزریں۔ کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ رات میں اس کے کٹے ہوئے پیر کو چوہے نوچتے رہے۔ صبح کی سیر کو نکلے ہوئے کچھ لوگوں نے اسے ٹرین کی پٹریوں کے پاس بیہوشی کی حالت میں دیکھا اور دہلی کے ایمس (AIIMS) اسپتال میں داخل کرا دیا۔ وہ تقریباً چار مہینوں تک زندگی اور موت کی لڑائی لڑتی رہی آخر کار زندگی جیت گئی اس کے مصنوعی پیر لگا دیا گیا اور دائیں پیر کی ہڈی جوڑنے کے لیے اسٹیل کی سلاخ ڈالی گئی۔ اس کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے ہر کسی کا خیال تھا کہ ایک پیر سے معذور یہ لڑکی اب زندگی میں کچھ نہیں کر پائے گی۔ لیکن لوگوں کا خیال غلط ثابت ہوا۔ اس لڑکی نے اپنی جسمانی کمزوری کو اپنی ذہنی کمزوری نہیں بننے دیا اور ایمس میں علاج کے دوران ہی ایوریسٹ کی چوٹی سَر کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ اس نے ایوریسٹ کی چوٹی سَر کرنے والی بچھندری پال کا فون نمبر انٹرنیٹ سے حاصل کیا اور اپنی کہانی سنا کر کہا کہ وہ ایوریسٹ کی چوٹی سَر کرنا چاہتی ہے۔ بچھندری پال نے اسے جمشید پور بُلایا۔ 2011 میں اگست کے آخری ہفتے میں ایمس سے چھٹی ملتے ہی وہ اپنے گھر جانے کے بجائے جمشید پور پہنچ گئی۔ اس سے مل کر اور اس کا حوصلہ دیکھ کر بچھندری پال بہت متاثر ہوئیں۔ انھوں نے کہا ''سمجھ لو کہ تم نے ایوریسٹ فتح کر لیا۔ بس اب تاریخ کا اعلان کرنا باقی ہے۔''

دو برس تک اس نے بچھندری پال کی نگرانی میں لیہہ لدّاخ میں Mountaineering کے گُر سیکھے۔ پھر اُترا کاشی کے نہرو اِنسٹی ٹیوٹ آف ماؤنٹینیرنگ اور ٹاٹا اسٹیل آف ایڈونچر فاؤنڈیشن سے ٹریننگ لینے کے بعد 31 مارچ کو اس کے مشن ایوریسٹ کا آغاز ہوا۔ اس مشن میں اس کے کوچ Susen Mahto بھی اس کے ساتھ تھے۔ 52 دنوں کی کڑی محنت اور جان فشانی کے بعد 21 مئی 2013 کو دن میں 10 بج کر 55 منٹ پر وہ ایوریسٹ کے 29028 فٹ اونچی چوٹی پر جا پہنچی

اور ترنگا لہرادیا۔ ایوریسٹ فتح کرنے والی سب سے پہلی اس معذور خاتون کا نام اُروِنما سنہا ہے۔ جس نے بھارت کا نام پوری دُنیا میں روشن کیا۔

اروِنما سنہا اُتر پردیش کے امبیڈکر نگر ضلع کے شاہ زاد علاقے کے پنڈاٹولا محلے میں 1988 میں پیدا ہوئی۔ اس کے والد فوج میں ملازم تھے۔ اس وجہ سے اس کا پریوار سلطان پور آگیا۔ وہ چار برس کی تھی کہ اس کے والد چل بسے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ امبیڈکر نگر پہنچی۔ وہاں اس کی ماں کو محکمۂ صحت میں ملازمت مل گئی۔ کسی طرح گزارا ہونے لگا۔ اس نے انٹر کے بعد ایل ایل بی کی پڑھائی کی۔ اسے بچپن سے والی بال کھیلنے کا شوق تھا۔ والی بال کھلاڑی کے طور پر ملک گیر سطح پر اس کی پہچان بن گئی تھی۔ وہ والی بال میں بھارت کو عالمی سطح پر شہرت دِلانے کی تمنا رکھتی تھی۔ لیکن ریل حادثے نے اس کی زندگی کا رُخ ہی بدل کر رکھ دیا۔

اُروِنما سنہا نے ایوریسٹ فتح کرنے کے بعد افریقہ میں Kilimanjaro۔ یورپ میں Elbrus، آسٹریلیا میں Kosciuszko، ارجنٹینا میں Aconcagua اور انڈونیشیا میں Carstensz Pyramid Pucak Jaya کی چوٹیاں بھی سَر کیں۔ اور بھارت کا نام دنیا میں مزید روشن کیا۔

اُروِنما نے اپنی کتاب "Born Again on the Mountain" میں اپنی ایوریسٹ مہم کی مشکلات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں ''سب سے مشکل ڈیتھ زون کھمبو آئس لینڈ کا تھا۔ پیروں کے نیچے برف کی چٹانیں اور سَر پر چمکتا سورج، کون سی چٹان کب پگھل کر گر جائے بتانا مشکل تھا۔ چٹان پر مجھ سے پہلے کوشش کرنے والے افراد کی درجن سے زیادہ لاشیں دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ درجہ حرارت °60 تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ایک جگہ میرا پیر برف میں بُری طرح دھنس گیا۔ اگر پیر کھینچنے کے لیے زور لگاتی ہوں تو مصنوعی پیر نکل جائے گا اور زور نہیں لگاتی ہوں تو آگے نہیں بڑھ سکتی۔ میں دھیرے دھیرے پیر گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ کیمپ سے فون آرہے تھے ''اروِنما واپس آجاؤ۔ جہاں تک تم پہنچی ہو وہ بھی ایک ریکارڈ ہے۔'' لیکن میں چلتی ہی رہی۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ میرے دونوں سلینڈروں کی آکسیجن ختم ہوگئی اور میرا سانس لینا مشکل ہوگیا۔ اسی اثناء میں شیرپا جو نیچے اتر رہا تھا اس نے وزن کم کرنے کے لیے ایک سلینڈر چھوڑ دیا۔ میرے کوچ Susen نے یہ دیکھا تو فوراً وہ سلینڈر مجھ تک پہنچایا۔ اگر ذرا سی بھی دیر ہوجاتی تو میرا مشن اور زندگی دونوں ختم ہوجاتے۔ SUSEN نے کہا ''اروِنما تم بڑی خوش قسمت ہو کہ ایسے مشکل وقت اور حالات میں تمہیں مدد مل گئی۔''

ایوریسٹ فتح کرنے پر اروِنما سنہا کو کئی انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ ان میں پدم شری ایوارڈ اور سلطان پور رتن ایوارڈ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انعامات کی شکل میں ملنے والی رقوم سے اروِنما سنہا نے اناؤ کے بیٹھر گاؤں میں غریب اور معذور کھلاڑیوں کے لیے چندر شیکھر آزاد کھیل اکیڈیمی قائم کی وہ ان دنوں CISF میں ہیڈ کانسٹبل کے طور پر خدمات انجام دے رہی ہیں اور اپنی اکیڈیمی کے لیے وقت نکالتی رہتی ہے۔

اُروِنما سنہا نے اپنی جدّ وجہد بھری زندگی کے ذریعے عملی طور پر ساری دنیا کے لوگوں کو یہ پیغام دیا کہ جسمانی معذوری کو ذہنی کمزوری نہ بننے دیں۔ اُروِنما سنہا پر ہر ہندوستانی بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔

■

Dr. Shaikh Rahman Akolvi
Deepak Chowk
Akola - 444006 (Maharashtra)

ریحان کوثر

صدارتی انتخاب

پیارے بچو! میرا خیال ہے کہ آپ کو بہت اچھی طرح معلوم ہوگا کہ ہمارا یہ پیارا ملک بھارت ایک جمہوری ملک ہے۔ ہمارے ملک کی حکومتوں کے انتخاب کا حق ملک کے تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو حاصل ہے۔ رائے دہی کا یہ قیمتی اور اہم حق ہمارے آئین نے ہمیں دیا ہے۔ آپ جب اٹھارہ سال کے ہوں گے تو ووٹ دینے کا حق آپ کو مل جائے گا۔ ملک کے بالغ شہری لوک سبھا، ودھان سبھا اور شہر بلدیہ یا گرام پنچایت وغیرہ انتخابات میں حصہ لیتے ہیں۔ ملک میں وفاقی طرز حکومت ہے جس میں وفاقی ، ریاستی اور مقامی سطح پر عہدیدار منتخب شدہ ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کو اس بات کا علم ہے کہ ہمارے ملک کے صدر جمہوریہ کس طرح منتخب کیے جاتے ہیں؟ کیا آپ نے اس بات پر کبھی غور کیا کہ ملک کے موجودہ صدر جمہوریہ جناب پرنب مکھرجی صاحب کس طرح منتخب ہوئے؟ اور ان کے بعد اسی سال یعنی 2017 میں جو کوئی بھی اس عہدے پر فائز ہوگا وہ کس طرح ہوگا۔ تو چلیے ہم بتاتے ہیں صدر جمہوریہ کس طرح منتخب کیے جاتے ہیں۔

بھارت کے صدر ملک کے سربراہ ہوتے ہیں۔ صدر انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کا باضابطہ سربراہ اور مسلح افواج کے کمانڈران چیف بھی ہوتے ہیں۔ یونین کے تمام انتظامی کام ان کے نام سے کیے جاتے ہیں۔ آرٹیکل 52 کے مطابق یونین کی انتظامی طاقت صدر جمہوریہ کے عہدے میں موجود ہے۔ تمام قسم کی ایمرجنسی لگانے اور ہٹانے کا حق صدر جمہوریہ کو ہوتا ہے۔ جنگ یا امن کا اعلان کرنے کا حق بھی بھارت کے صدر جمہوریہ کے پاس ہوتا ہے۔ وہ ملک کا پہلا شہری ہے۔ بھارت کے صدر کا بھارت کا شہری ہونا ضروری ہے۔ عام انتخابات کے برعکس عہدہ صدارت کے لئے ہونے والا انتخاب کسی شور شرابے کے بغیر خاموشی سے انجام پذیر ہوتا ہے۔

صدر کے پاس کافی طاقت ہوتی ہے لیکن کچھ مستثنیات

کے علاوہ صدر کے عہدے کے زیادہ تر حقوق اصل میں وزیراعظم کی سربراہی میں کابینہ کے ذریعے استعمال کیے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو، صدر کا رول صرف ایک آئینی عہدہ تک محدود سمجھا جاتا ہے کیوں کہ تمام تر انتظامی اختیارات وزیراعظم کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ بھارت کے صدر نئی دہلی میں واقع صدارتی محل (راشٹرپتی بھون) میں رہتے ہیں، جسے رائے سینا ہل کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ صدر دو یا دو سے زیادہ کتنی مرتبہ بھی عہدے پر رہ سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔ اب تک صرف پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد ہی اس عہدے پر دو مدت مکمل کر چکے ہیں۔

صدر بننے کے لیے ضروری قابلیت

بھارت کا کوئی شہری جس کی عمر 35 سال یا اس سے زیادہ ہو وہ صدر کا امیدوار ہو سکتا ہے۔ صدر کے امیدوار کو لوک سبھا کا رکن بننے کی قابلیت ہونی چاہئے اور حکومت کے تابع کوئی فائدہ کا عہدہ اس کے پاس نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن مندرجہ ذیل کچھ عہدیدار کو صدر کے امیدوار ہونے کی اجازت دی گئی ہے:

- موجودہ صدر
- موجودہ نائب صدر
- کسی بھی ریاست کے گورنر
- ملک یا کسی ریاست کے وزیر

بھارت دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔ آئینی عمل کے تحت ہر پانچ سال بعد صدر کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں صدر کے انتخاب کا طریقہ منفرد ہے۔ اس طریقے کو آپ سب سے بہترین آئینی طریقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں کئی ممالک میں ہونے والے صدارتی انتخابات کے طریقوں کی اچھی باتوں کو شامل کیا گیا ہے۔ بھارت کے صدر کا الیکشن ایک حلقہ انتخاب (الیکٹورل کالج) کرتا ہے، لیکن اس کے اراکین کی نمائندگی متناسب ہوتی ہے۔ ان کا واحد ووٹ ٹرانسفر ہوتا ہے، لیکن ان کی دوسری پسند کی بھی گنتی ہوتی ہے۔ حلقہ انتخاب میں کل 4896 ووٹر ہوتے ہیں۔ ووٹوں کی مختلف قدروں کو سمجھنے کے لئے کچھ باتوں کا علم ہونا ضروری ہے۔

بالواسطہ الیکشن

بھارت کے صدر جمہوریہ کا انتخاب الیکٹورل کالج یعنی حلقہ انتخاب کرتا ہے۔ یعنی ہمارے ملک کی عوام اپنے صدر کا انتخاب براہ راست نہیں کرتی، بلکہ اس کے ووٹ سے منتخب کردہ نمائندے کرتے ہیں۔ اس طریقے کے انتخاب کو بالواسطہ الیکشن کہتے ہیں۔

ووٹ کا حق

اس میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوان (لوک سبھا اور راجیہ سبھا) اور تمام ریاست کی اسمبلی (ودھان سبھا) کے منتخب ارکان ووٹ ڈالتے ہیں، لیکن صدر کی طرف سے پارلیمنٹ میں نامزد رکن اور ریاستوں کی قانون ساز کونسلوں کے رکن ووٹ نہیں ڈال سکتے کیونکہ وہ عوام کے منتخب کردہ رکن نہیں ہوتے۔ یہ انتخاب وفاقی اور ریاستی اسمبلیوں پر مشتمل حلقہ انتخاب کی جانب سے کیا جاتا ہے۔

نمبر شمارہ	ریاست یا یونین ٹیرٹری کا نام	کل اسمبلی نشستیں (اختیاری)	آبادی (1971 کی مردم شماری)	ممبران اسمبلی کے ایک ووٹ کی قدر	ریاست یا یونین ٹیرٹری کے کل ووٹوں کی قدریں
1	آندھرا پردیش	175	43,502,708*	148	25,900
2	اروناچل پردیش	60	467,511	8	480
3	آسام	126	14,625,152	116	14,616
4	بہار	243	42,126,236	173	42,039
5	دہلی	70	4,065,698	58	4,060
6	گجرات	182	26,697,475	147	26,754
7	ہریانہ	90	10,036,808	112	10,080
8	جموں و کشمیر	87	6,300,000	72	6,264
9	جھارکھنڈ	81	14,227,133	176	14,256
10	ناگالینڈ	60	516,499	9	540
11	اڑیسہ	147	21,944,615	149	21,903
12	پنجاب	117	13,551,060	116	13,572
13	راجستھان	200	25,765,806	129	25,800
14	تامل ناڈو	234	41,199,168	176	41,184
15	تلنگانہ	119	43,502,708*	148	17612
16	اتر پردیش	403	83,849,905	208	83,824
17	مغربی بنگال	294	44,312,011	151	44,394

اسی طرح دیگر ریاستوں کے ممبران اسمبلی کے ووٹوں کو شمار کیا جاتا ہے۔ یہ اعداد و شمار 2012 کے مطابق ہیں۔

سنگل ٹرانسفریبل

اس انتخابات میں ایک خاص انداز میں ووٹنگ ہوتی ہے، جسے 'سنگل ٹرانسفریبل ووٹ سسٹم' کہتے ہیں۔ یعنی ووٹر ایک ہی ووٹ دیتا ہے، لیکن اپنا سنگل ووٹ دیتے وقت صدارتی انتخابات میں حصہ لے رہے تمام امیدواروں میں سے اپنی ترجیح طے کر دیتا ہے۔ ووٹر بیلیٹ پیپر پر اپنی پسند کو پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر شمار کے ذریعے نشاندہی کرتا ہے۔ اگر پہلی پسند والے امیدوار کے ووٹوں سے فاتح امیدوار کا فیصلہ نہیں ہو سکا تو امیدوار کے کھاتے میں ووٹر کی دوسری پسند کو نئے سنگل ووٹ کی طرح منتقل (ٹرانسفر) کیا جاتا ہے۔

متناسب نظام

ووٹ ڈالنے والے ممبران پارلیمنٹ اور ممبران اسمبلی کے ووٹ کی اہمیت الگ الگ ہوتی ہے۔ دو ریاستوں کے اراکین اسمبلی کے ووٹوں کی اہمیت مختلف ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اتر پردیش اور

منی پور جیسی ریاستوں کے ممبران اسمبلی کے ووٹ کی اہمیت (قدر) الگ الگ ہیں۔ان ووٹوں کی اہمیت جس نظام سے طے ہوتی ہے، اسے متناسب نمائندگی کا نظام کہتے ہیں۔

ممبر اسمبلی کے ووٹ

ریاستوں کے ممبران اسمبلی کے ووٹ کی اہمیت (قدر) متعین کرتے وقت رکن اسمبلی جس ریاست کا ممبر اسمبلی ہو، اس کی آبادی دیکھی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ اس ملک کے اسمبلی ممبران کی تعداد کو بھی ذہن میں رکھا جاتا ہے۔ووٹ کی اہمیت (قدر) نکالنے کے لیے ریاست کی آبادی کو عوام کے ذریعے منتخب ممبران اسمبلی کی تعداد سے تقسیم کیا جاتا ہے۔اس طرح جو بھی تعداد ملتی ہے، اس عدد کو ایک ہزار سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ اب جو اعداد و شمار ملتا ہے، وہی اس ریاست کے ایک رکن اسمبلی کے ووٹ کی قدر (اہمیت) ہوتی ہے۔ایک ہزار سے تقسیم دینے پر باقی پانچ سو سے زیادہ ہو تو اس قدر میں ایک جوڑ دیا جاتا ہے۔ حلقہ انتخاب میں 4120 ممبران اسمبلی کے ووٹ ہوتے ہیں۔مثال کے لیے کچھ ریاستوں کے ممبران اسمبلی کے ووٹوں کی تعداد کے لیے دیکھیں ٹیبل باکس۔

رکن پارلیمنٹ کے ووٹ

قومی اسمبلی لوک سبھا کے ارکان کی تعداد 545 ہے جن میں 543 ارکان کو عوام کی جانب سے براہ راست پانچ سال کے لیے منتخب کیا جاتا ہے جبکہ دو ارکان کو صدر نامزد کرتا ہے جو اینگلو انڈین کمیونٹی کی نمائندگی کرتے ہیں۔راجیہ سبھا کے ارکان کی تعداد 245 ہے جن میں سے 233 ارکان کو چھ سال کی مدت کے لیے چنا جاتا ہے جن میں ایک تہائی ارکان ہر دو سال بعد ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ان ارکان کا انتخاب بالواسطہ کیا جاتا ہے جن کے لیے ریاستی اسمبلیاں اور وفاقی علاقہ جات کے قانون ساز ووٹ دیتے ہیں۔ان ارکان کا انتخاب 'واحد قابل تبادلہ ووٹ' کے ذریعے متناسب نمائندگی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

ممبران پارلیمنٹ کے ووٹوں کے اہمیت (قدر) بھی مختلف ہوتی ہیں۔سب سے پہلے تمام ریاستوں کی اسمبلیوں کے منتخب کردہ رکن کے ووٹوں کی اہمیت (قدر) شامل کی جاتی ہے۔اس اجتماعی قدر کا راجیہ سبھا اور لوک سبھا کے منتخب کیے

گئے رکن کی کل تعداد سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس طرح جو عدد حاصل ہوتا ہے، وہ ایک ممبر پارلیمنٹ کے ووٹ کی قدر (اہمیت) ہوتی ہے۔ اگر اس طرح تقسیم کئے جانے پر باقی 0.5 سے زیادہ بچتا ہو تو قدر میں ایک کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ حلقہ انتخاب میں 776 ممبران پارلیمنٹ کے ووٹ ہوتے ہیں۔

پارلیمنٹ کے اراکین کی تعداد (منتخب) = لوک سبھا (543) + راجیہ سبھا (233) = 776

ہر ووٹ کی قدر = 549.474 / 776 = 708.09

پارلیمنٹ کے ووٹوں کی کل قیمت = 776 × 708 = 549408

ووٹوں کی گنتی کا طریقہ

صدارتی انتخابات میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے سے ہی جیت طے نہیں ہوتی۔ صدر وہی منتخب ہوتا ہے جو ووٹروں یعنی ممبران پارلیمنٹ اور ممبران اسمبلی کے ووٹوں کی کل اہمیت (قدر) کا نصف سے زیادہ حصہ حاصل کرے۔ یعنی اس انتخاب میں پہلے سے طے ہوتا ہے کہ جیتنے والے کو کتنے ووٹ یا اہمیت (قدر) حاصل کرنا ہوگا۔ فی الحال صدارتی انتخابات کے لیے جو حلقہ انتخاب (الیکٹورل کالج) ہے، اس کے اراکین کے ووٹوں کی کل اہمیت (قدر) 1098882 ہے۔ جیت کے لیے امیدوار کو 549442 ووٹ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ جو امیدوار سب سے پہلے یہ حدف حاصل کرتا ہے، وہ منتخب کرلیا جاتا ہے۔

پہلی پسند یا ترجیح کی اہمیت

پہلی ترجیح سمجھنے کے لئے ووٹ کی گنتی میں ترجیح پر غور کرنا ہوگا۔

رکن پارلیمنٹ یا رکن اسمبلی ووٹ دیتے وقت اپنے بیلٹ پر ہی نمبر شمار سے اپنی پسند کے امیدوار بتا دیتے ہیں۔ سب سے پہلے تمام ووٹ پر درج پہلی ترجیح کے ووٹ گنے جاتے ہیں۔ اگر اس پہلی گنتی میں ہی کوئی امیدوار جیت کے لئے ضروری اہمیت (قدر) ووٹ کا ہدف حاصل کرلے تو اس کی فتح ہوگئی لیکن اگر ایسا نہ ہوسکا تو دوسری ترجیح کی بنیاد پر ووٹ گنے جاتے ہیں۔ پہلے اس امیدوار کو باہر کیا جاتا ہے، جسے پہلی گنتی میں سب سے کم ووٹ ملے، لیکن اسے حاصل ووٹوں سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کی دوسری پسند کے کتنے ووٹ کس امیدوار کو ملے ہیں۔

انتخاب میں ہار اور جیت

ووٹ تفویض کرنے کے لیے ایک فارمولہ استعمال کیا گیا ہے تاکہ ہر ریاست کی آبادی اور اس ریاست کے اسمبلی کے ارکان کے ووٹ ڈالنے کی تعداد کے درمیان ایک تناسب رہے اور ریاست اسمبلیوں کے ارکان اور قومی ممبران پارلیمنٹ کے درمیان ایک تناسب رہے۔ اگر کسی امیدوار کو اکثریت حاصل نہیں ہوتی ہے تو ایک نصب نظام ہے جس سے ہارنے والے امیدواروں کو مقابلے سے ہٹا دیا جاتا ہے اور ان کو ملے ووٹ دیگر امیدواروں کو تب تک منتقل ہوتے ہیں، جب تک کسی ایک کو اکثریت نہیں ملتی۔ صدر کے الیکشن سے متعلق کسی بھی تنازعہ میں فیصلہ لینے کا حق سپریم کورٹ کو ہے۔

■

Rehan Kausar
Dr. Sheikh Bunkar Colony
Kamptee - 441001
Distt.: Nagpur (Maharashtra)

مظہر الاسلام

سقراط

(یونان قبل مسیح علم و ثقافت کا مرکز رہا۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بھی چار سو سال پہلے سقراط نام کا ایک فلسفی ہوا کرتا تھا۔ بچپن میں میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس یہ سترہ اٹھارہ سال کا نوجوان اپنی باتوں، فہم و فراست کے لیے جانا جاتا... یہ پستہ قد... چپٹی ناک والا... آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی... عجیب شکل و صورت والا ہر دل عزیز تھا۔ اکثر سڑکوں سے نکلتا تو بچے اس کا مذاق اڑاتے۔ اس کی شکل صورت پر طنز کستے مگر وہ ان چیزوں سے لاپرواہ لوگوں سے بات کرتا... اس لڑکے کا نام تھا سقراط)

پہلا منظر

سڑک کا چوراہا ہے جہاں آپس میں لوگ اسے دیکھ کر کہتے ہیں۔

پہلا شخص: ”کون ہے یہ لڑکا۔ کس قدر گندے کپڑے ہیں اور کیسی عجیب سی شکل ہے۔“

دوسرا شخص: ”یہ سنگ تراش کا لڑکا ہے جو مورتیاں بناتا ہے۔ باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے تو کپڑے گندے تو رہتے ہی ہیں۔ بیچارہ بے حد غریب ہے۔ ذہن کا تیز اور حاضر جواب... اس کی باتوں میں بڑی گہرائی ہوتی ہے۔“

تیسرا: ”ہاں بھائی... شکل وصورت تو کچھ نہیں مگر بات بڑے پتے کی کہتا ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ایسی بتاتا ہے کہ انسان سوچنے پر مجبور ہو جائے۔“

پہلا شخص: وہ کہتا ہے کہ یونان کے دیوتاؤں کے آگے جانوروں کی بلی مت چڑھاؤ...

دوسرا: ”یعنی اہنسا کا پجاری۔“

پہلا: اگر حاکم وقت کو پتہ چل جائے تو اس کی موت یقینی ہے... اور پھر روحانی پیشوا تو یوں بھی اس کے جانی دشمن ہیں۔

تیسرا: ہاں... ممکن ہے... لوگ سوال جواب کرنے لگے ہیں۔ خاص کر نوجوان طبقہ طرح طرح کے سوالات کھڑے کر رہا ہے۔

دوسرا شخص: ”اس کی گردن تو لگتا ہے مالک نے

بنائی ہی نہیں۔ سر ایسا رکھا ہے... جیسے جسم پر کسی نے ہانڈی الٹ دی... یہ کہہ کر قہقہہ لگاتا ہے۔

پہلا شخص: ''اس طرح مذاق اڑانا ٹھیک نہیں... خدا ناراض ہوتا ہے۔ شکل وصورت تو خدا کی بنائی ہوئی ہوتی ہے۔''

دوسرا شخص نادم ہوکر— معاف کرنا میں نے مذاقاً کہا۔

پہلا شخص: ''مذاق میں بھی نہیں کہنا چاہیے۔''

دوسرا منظر

(سڑک پر لوگوں کی بھیڑ ہے... سقراط نظر آتا ہے... کچھ نوجوان اس کی طرف لپکتے ہیں)

یامش: ''سقراط—ایک منٹ ہمیں بھی...''

سقراط: پوچھو!۔

یامش: دوست برا مت ماننا... لوگ تمھارے خلاف ہو رہے ہیں۔

سقراط: ''کس بات پر۔''

یامش: ''یہی کہ تم جو کہتے ہو کہ یونان کے دیوتاؤں پر بلی چڑھانا ٹھیک نہیں... سوچو... جو روایت سیکڑوں سال سے چلی آرہی ہے... وہ کس طرح ترک کر دی جائے۔''

سقراط: ''اس لیے کہ دیوتاؤں کو خون خرابہ اچھا نہیں لگتا۔ بھلا ہم ان بے زبانوں کی جان کیوں لیں... دیوتاؤں کو خوش کرنے کے اور بھی طریقے ہیں۔''

یامش: لوگ یہی سوچتے ہیں کہ ان کی قربانی رنگ لاتی ہے... اور لوگوں کی منتیں پوری ہوتی ہیں۔

سقراط: وہ سب کے کام بناتا ہے... دیر سویر... وہ سب پر رحم کرتا ہے۔ پھر انسان ظلم کیوں کرے۔ پھر نیکی کے اور بھی کام ہیں...

یامش: ''وہ کیا؟''

سقراط: ''یہی کہ ماں باپ۔ غریبوں کی خدمت کرنے سے بڑا ثواب کوئی نہیں... بھوکوں کو کھانا کھلاؤ... لوگ بوڑھے ماں باپ کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں... ان کی زندگی میں ہی انھیں سکھ پہنچاؤ۔''

دوسرا لڑکا: ''تم ٹھیک کہتے ہو... بہت سے لوگ بیمار... لاچار ماں باپ سے منہ موڑ لیتے ہیں... خدا کی رضا حاصل کرنی ہے تو ان کی خدمت کرو۔''

سقراط... ''اس کے علاوہ کسی کا دل نہ دکھاؤ۔ امانت میں خیانت نہ کرو... کمزوروں سے رحم کا سلوک کرو۔''

(سقراط کو کچھ لوگ پسند کرتے ہیں... کچھ ناپسند!)

بہت سے لوگ اس کو اپنا مہمان بنانا فخر کی بات سمجھتے تھے۔ اس کی باتوں سے سبق حاصل کرتے اور اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے— دوسرے وہ لوگ تھے جو سمجھتے تھے کہ سقراط نوجوانوں کو دین کے خلاف ذہن پیدا کر رہا ہے... ایسے لوگ سوالات کرتے تھے جو دین میں مداخلت سمجھ رہے تھے...

تیسرا منظر

(دربار کا منظر ہے۔ سقراط کو عدالت میں بلایا گیا ہے۔ امراء و وزراء ایک طرف مسند نشین ہیں... جج صاحبان اپنی نشستوں پر ہیں۔ سقراط پھٹے حال ہے... کپڑوں پر دھول جمی ہے)

حاکم وقت: سقراط... ''تم پر الزام ہے کہ تم نوجوانوں کو حکومت اور دین کے خلاف اُکسا رہے ہو...''

سقراط: اے مالک الملک... ناچیز وہی کہتا ہے جو سچ ہے... جو حق ہے... اس میں کچھ بھی برا نہیں... وہ دربار پر نظر دوڑاتا ہے۔ اس کے دو شاگرد... کریٹو... اور پلیٹو کورٹ میں موجود ہیں۔

جج: تمھاری نظر میں جانوروں کی دیوتاؤں پر بلی چڑھانا

جائز نہیں...

دوسرا جج: سیکڑوں سال سے چلی روایت توڑی نہیں جاسکتی... تم نوجوانوں کے دماغ میں شک و شبہات پیدا کررہے ہو... لوگ مخمصے میں ہیں... اور بہت سی باتوں کی روگردانی کررہے ہیں۔

حاکم: ''ان الزامات کے تحت۔ کیوں نہ تمھیں موت کی سزا دی جائے...''

سقراط: سچ کے لیے ایک نہیں ہزار موت مرنے کو تیار ہوں۔

حاکم: غصہ سے... عدالت کل تک کے لیے ملتوی کی جاتی ہے۔

(سقراط... عدالت کے باہر تھے... پلیٹو اور کریٹو سقراط سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ یا تو کہیں چھپ جائے... کہیں بھاگ جائے... مگر سقراط ایسا کرنے سے انکار کردیتا ہے)

سقراط: نہیں۔ بزدل لوگ بھاگتے ہیں... میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ہے... میں نے وہی کہا ہے جو حق ہے۔ تم بھی اگر میری طرح سوچو گے تو تم میں بھی صحیح فیصلہ لینے کی جرأت پیدا ہوگی... سچ کے لیے جیو... سچ کے لیے مرو!''

پلیٹو: آپ کے بعد ہماری رہنمائی کون کرے گا... ایک طرح سے ہم یتیم کی سی زندگی گزاریں گے۔

سقراط: تم غمگین نہ ہو— ابھی تم جوان ہو... اور میری زندگی پوری ہو چکی ہے۔ مرنا تو ایک بار ہی ہوتا ہے۔

(کریٹو اور پلیٹو سسکنے لگتے ہیں)

چوتھا منظر

(عدالت کا کمرہ ہے جو کھچا کھچ بھیڑ سے بھرا ہے۔ سقراط کے حامی اور مخالف دونوں موجود ہیں۔ سقراط چھڑی کے سہارے جھکا ہوا ہے۔)

جج: ''سقراط تمھیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے۔''

سقراط: سقراط نے دھیمے لہجے میں کہا ''میں وہی کہوں گا جو سچ ہے... چاہے مجھے جان ہی کیوں نہ دینی پڑے...'' پھر نظریں گھما کر کورٹ کو دیکھتا ہے۔

جج: مندرجہ بالا الزامات کے تحت سقراط... تمھیں موت کی سزا دی جاتی ہے...

(سزا سنائے جانے کے بعد جیلر سقراط کو قید خانے کی کوٹھری کی طرف لے چلتا ہے۔ اس کے چاہنے والے... اس کے دو بچے اور اس کی بیوی اس کے پیچھے چل رہے ہیں۔)

جیلر: ''میں سمجھتا ہوں کہ اب آخری گھڑی آپہنچی ہے۔ جب تمھیں زہر کا پیالہ دیا جائے... تو امید کرتا ہوں کہ تم اسے پی جاؤ گے... سقراط میں سمجھتا ہوں کہ تم سچ کے لیے اپنی جان دے رہے ہو... یونان کے عظیم انسان... میرا آخری سلام۔

(اور یہ کہہ کر سقراط کو زہر کا پیالہ دیتا ہے۔ سقراط پیالہ منہ سے لگا کر کچھ سوچتا ہے... پھر ہلکی آواز میں کریٹو سے مخاطب ہوتا ہے...)

کریٹو: ''میں نے فلاں شخص سے ایک مرغ ادھار لیا تھا... کیا تم اسے دے دو گے۔''

کریٹو: بابائے یونان... ادا کردیا جائے گا۔

اور کچھ کہنا ہے...؟

مگر جواب نہ پاکر سمجھ گیا کہ وہ عظیم شخص اس دنیا سے رخصت ہوا... اس نے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کی مگر ضبط نہ کرسکا... اور تمام کمرہ رونے اور سسکیوں کی آواز سے دوچار ہوا۔

■

Mazharul Islam
31, Bahelman, Upar Kot
Bulandshahr - 203001

راشد جمال فاروقی

میرا دیش ہے سب سے نیارا

میرا دیش ہے سب سے نیارا
میں بھارت کا راج دُلارا
اس نے میری شان بڑھائی
میں نے اس پر تن من وارا

اس کے دریا اس کی ندیاں
اس کے کوچے اس کی گلیاں
اس کے پربت اس کے ساگر
میرے اک اک درد کا درماں

کیا کیا موسم کیا کیا فصلیں
ہم آخر کیسے نہ مچلیں
ایک نشہ ہے اس کی فضا میں
کس کو سنبھالیں کیسے سنبھلیں

رام، کرشن، نانک کی بانی
گنگا اور جمنا کی روانی
میر، کبیر کے روشن قصے
چشتی اور خسرو کی کہانی

میں بھارت کا راج دلارا
بھارت ماں کی آنکھ کا تارا
اس نے میری شان بڑھائی
میں نے اس پر تن من وارا

Rashid Jamal Farooqui
C-1452, IDPL Township Virbhadra
Rishikesh Dehradun - 249202 (UK)

حبیب سیفی

بدلاؤ آئے گا

ابھی اسکول جانے دے تری باتیں سنوں گا کل
ذرا سی بھی نہیں فرصت، مگر تجھ سے ملوں گا کل

کتابیں بستہ یونیفارم کھانا مفت ملتا ہے
میں ان پڑھ باپ کا بیٹا پڑھا لکھا بنوں گا کل

مرے سپنوں کا بھارت ہے اسی تعلیم میں پنہاں
ہے کوشش پچھڑی قوموں کا نہ میں طعنہ سہوں گا کل

ترقی دیش میں ہوگی تو خوش حالی بھی آئے گی
اگر محنت کروں گا اب سکوں سے پھر رہوں گا کل

سبھی کو فیض پہنچائیں کئی اسکیمیں مرکز کی
ابھی سب کام کرنے ہیں نہ میں باقی کروں گا کل

مجھے اسکیل بھارت میں بس حصے داری کرنی ہے
ہنر تو سیکھ لینے دے فراغت سے رہوں گا کل

مرے خود کے بدلنے سے ہی اب بدلاؤ آئے گا
کما کے خرچ کرتا ہوں جمع پونجی رکھوں گا کل

Habib Saifi
New Delhi

محمد خلیل

کولکاتا کے سائنسی شہر کی سیر

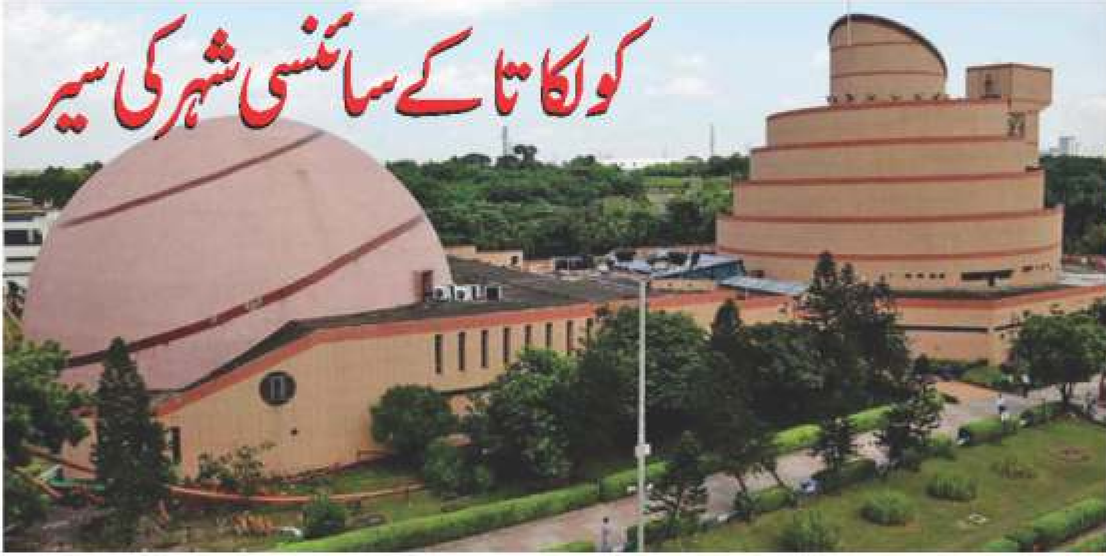

کولکاتا میں سائنس کے شہر کو قائم ہوئے تقریباً بیس سال ہونے جا رہے ہیں۔ یہ پچاس ہیکٹر کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن ابھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کو اس سائنس کے شہر کے بارے میں معلوم ہی نہیں ہے۔ سائنس کی معلومات ہمارے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ اِس لحاظ سے بھی یہ ہمارے لیے کسی خزانے سے کم نہیں ہے۔ آج ہم ایسے ہی سائنس کے شہر کی سیر کریں گے۔ یہ سائنس...... جنوب ایشیا کا سب سے بڑا سائنسی مرکز ہے۔

اگر آپ اس شہر کو دیکھنے پہنچیں تو سائنسی شہر کے چاروں طرف ہری بھری گھاس کے میدان نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی بنجر زمین پر مٹی بچھا کر تقریباً تین لاکھ پودے لگائے گئے ہیں اس طرح یہاں کی زمین کس قدر خوبصورت ہوگئی ہے۔ گھاس کے میدانوں میں مختلف پھولوں کی قسمیں اور مختلف طرح کے درخت آپ کے پہنچنے پر آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔ کہتے ہیں یہاں پہلے کافی گندگی تھی جب کبھی سائنس کا شہر نہیں تھا لیکن شہر کے بسنے کے بعد اب گئے ہوئے پرندے یہاں کی خوبصورت فضا کو دیکھ کر واپس آنے لگے ہیں، پہلے کی گندی جھیل اب بہت خوبصورت صاف پانی والی جھیل میں بدل گئی ہے۔ اس طرح اس جھیل سے اب مچھلیوں اور پرندوں دونوں کو ہی لگاؤ پیدا ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بچے اور بڑے بھی اس جھیل کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ جھیل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ شہر کے قریب کا علاقہ ٹھنڈا رہتا ہے۔ کوئی نیا آدمی جب یہاں پہنچتا ہے تو اُسے ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی عجیب و غریب شہر میں داخل ہوگیا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ قدرت کا ماحول جو پہلے تباہ ہوگیا تھا اب اُس کو قائم کرتے ہیں اس سائنسی شہر کی بڑی مدد کام میں آئی ہے۔ سائنسی شہر دور سے دیکھنے میں جہاز کی شکل کا نظر آتا ہے اور اپنی خوبصورتی سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس شہر کے تین خاص حصے ہیں۔ پہلا حرکت کرنے والا علاقہ یعنی (ڈائی لوموشن ایریا)، دوسرا خلائی تھیٹر اور تیسرا سائنسی پارک ہے۔ اس پارک میں بہت سے تعجب خیز پودوں کی بہت ساری قسمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس طرح بہت سی قسموں کی تتلیاں اور پرندے بھی

پارک میں موجود ہیں، فوارہ موسیقی (میوزک) سے آراستہ ہے، یہاں قدیم جانور ڈائناسور پر بھی نمائش دیکھنے کو ملتی ہے لیکن یہ آپ پر ہے کہ آپ کیا دیکھنا چاہتے ہیں۔ پکنک منانے کے علاقے بھی یہاں ہیں۔ یہاں بیٹھنے کا ہال ایئر کنڈیشن سے آراستہ ہے اس طرح گرمی کا ذرا احساس نہیں ہوتا۔

آیئے حرکت کرنے والی چیزوں کے علاقے کی سیر کریں۔ یہاں کوئی بھی رکی ہوئی چیز نظر نہیں آئے گی۔ یہاں سامنے بڑا چھتر لگا ہوا یہ ڈھانچہ سچ پوچھیے تو ایک دلچسپ آلہ ہے۔ جیسے ہی آپ بٹن دبائیں گے اس ڈھانچے کے اندر دو گول شکل کی گیند لڑھکنے لگتے ہیں۔ کافی اونچائی سے نیچے پہنچتے ہوئے یہ کئی شکلوں کے کارنامے دکھاتے ہیں یہ میوزک سے آراستہ گھنٹیاں بجاتے ہیں اور بجلی بھی پیدا کرتے ہیں۔ اب آپ کو بالوں کو سنوارنے کا ایک نیا طریقہ بتاتے ہیں اس کے لیے ایک میٹر جیسا نیا آلہ سائنسی شہر میں رکھا گیا ہے جیسے ہی آپ سیڑھی کے ڈنڈے میں قدم رکھیں گے اور جنریٹر کو چھوئیں گے چھونے سے ڈریں ذرا نہیں کرنٹ کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

چھونے کے کچھ لمحوں بعد آپ کے بال کانٹوں کی طرح کھڑے ہو جائیں گے۔ جیسے آپ نے بال سنوارنے کا کوئی نیا طریقہ معلوم کر لیا ہو لیکن یہ اثر ذرا دیر کے لیے باقی رہے گا وہ اس لیے کہ جس لمحہ آپ جنریٹر سے ہاتھ ہٹائیں گے آپ کے بال پہلی والی حالت میں آجائیں گے۔ یہ کس قدر دلچسپ نمونہ برقی کا ہے اور پھر بٹن کو دباتے ہی بھی رُولر جلدی سے لڑھکتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ اسی درمیان ایک رولر بہت زیادہ آہستہ آہستہ کیوں چلتا ہوا دکھائی پڑتا ہے۔ اگر اس کی وجہ آپ کے سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو نمائش کی کھڑکی پر اس کی وجہ جواب کی شکل میں دی ہوئی ہے۔ یعنی ایک برقی مقناطیس (الیکٹرومیگنیٹ) اس ست رولر کی رفتار کو روک رہا ہے۔ اب اس ماڈل کو دیکھ کر پہیلی (کوئز) حل کریں یہ ایک Y شکل کی نلی ہے جو کھڑی شکل میں روکی گئی ہے۔ جیسے ہی آپ بٹن دباتے ہیں پانی نلی سے بہتا ہوا بیچ کے نقطے تک آئے گا۔ آپ کو یہ خیال ہوگا کہ یہ نیچے کی طرف بہے گا لیکن پانی تو اوپر والی نلی سے بہتا ہوا باہر نکل گیا جبکہ نیچے والی نلی سے ذرا بھی پانی باہر نہیں آیا۔ ایسا کیوں ہوا اس کا جواب سائنس کے پاس ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نلی کے اندر کچھ خاص قسم کے انتظام موجود ہیں تاکہ پانی صرف اوپری نلی سے نکلے۔

یہاں ایک انوکھی کرسی پر بیٹھنا بھی کچھ کم لطف اندوز نہیں ہے۔ بس ایک مرتبہ آپ کرسی پر بیٹھ جائیں پھر کوئی نہیں بتا سکتا کہ کرسی کس کس طرف گھومے گی۔ آپ کو یہ کرسی الٹا بھی لٹکا سکتی ہے لیکن بچوں کو اس کرسی پر بیٹھنا بے حد پسند آتا ہے۔ ممکن ہے آپ بھی اس کرسی کو پسند کریں لیکن کم از کم بھرے پیٹ پر جب آپ نے کھانا کھایا ہو تو اس کرسی پر بیٹھنے کی غلطی نہ کریں۔

اگر آپ قدیم مصر کی سیر کرنا چاہتے ہیں تو ادھر آیئے اور

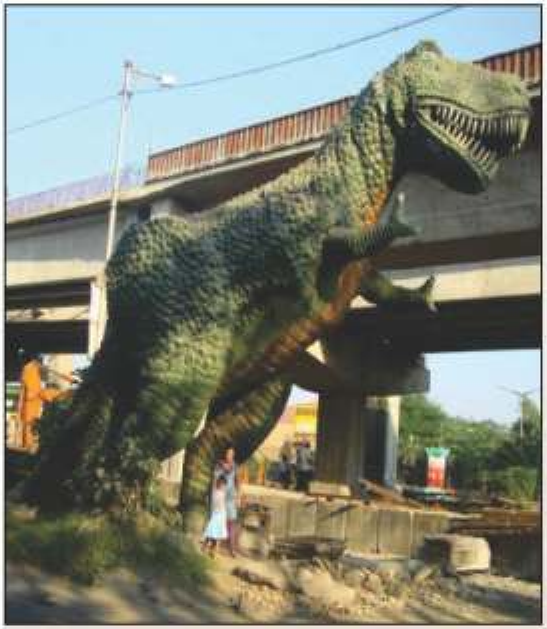

ٹائم مشین کی گدی پر بیٹھ جائیے۔ بیٹھتے ہی جہاز نما ڈھانچے کا دروازہ بند ہوجائے گا۔ اس میں ایک ٹی وی پردہ لگا ہوا ہے۔ جہاں آپ مختلف قسموں کی تصویریں دیکھیں گے جس میں سونے کا خزانہ، پیرامیڈ وغیرہ دکھائی پڑتے ہیں۔ لیکن سفر ختم ہونے کے بعد بھی آپ پر اس سفر کا احساس گہرائی کے ساتھ موجود رہے گا۔

سائنسی شہر میں ایک ایسا اسپیس تھیٹر ہے جس کے ذریعے آپ ستاروں کی دنیا کی سیر کرسکتے ہیں۔ یہ تھیٹر کمپیوٹر سے پوری طرح آراستہ ہے۔ اس میں لگی ہوئی پروجیکشن مشین اس قدر اچھی ہے کہ آپ تقریباً پچیس ہزار ستاروں اور سیاروں کو دیکھ سکتے ہیں اس تھیٹر میں پہنچ کر آپ ایسا محسوس کریں گے جیسے آپ خلا میں پہنچ گئے ہیں۔ اس تھیٹر میں ہر روز دو شو دکھائے جاتے ہیں۔

سائنسی شہر میں آپ مشین کے ذریعے سمندری لہروں کو بنا سکتے ہیں۔ بالوئی دلدل میں (کول سینڈ) میں ڈوبنے کا تجربہ کرسکتے ہیں۔ اگر آپ کی کھیل سے دلچسپی ہے تو آپ گیند بازی بھی کرسکتے ہیں اور خود سے پھینکی ہوئی گیند کی رفتار کو معلوم کرسکتے ہیں۔

یہاں دس قسموں کی تتلیوں کے خاندان کو بڑھانے کے لیے بھی انتظام کیا گیا ہے۔ وہ بڑے آرام سے یہاں رہتی ہیں ان کی بڑی دیکھ ریکھ رہے۔ اُن کی رش کے لیے یہاں پر...... انھیں کھانے کے لیے گلوکوز، فرکٹوز اور سکروز کا گھول دیا جاتا ہے۔ تتلیوں کو کھانے کے لیے پودوں کا انتظام ہے۔ خاص طور پر کبری اور دیوار کے پودوں کی پتیاں کھانا انھیں بے حد پسند ہے۔ اب تو رنگین تتلیاں شہروں سے تو جیسے غائب سی ہوگئی ہیں شاید سائنسی شہر انھیں دوبارہ واپس لانے میں کامیاب ہوجائے۔

اب کمپیوٹر والے فوارہ کا ذکر بھی سنیے اس میں پانی کی لہریں موسیقی کے ساتھ بہتی ہیں اس کی خوبصورتی بس دیکھنے سے اندازکی جاسکتی ہے۔ یہاں آپ کو ڈائنا سور کی چنگھاڑ بھی سن سکتے ہیں۔ جو کمپیوٹر کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔ یہاں بڑے دانت والی مچھلی ہے، گھڑیال والی مچھلی بھی ہے جو مچھلی کم اور گھڑیال زیادہ نظر آتی ہے۔ یہاں نایاب اور نہ دیکھی گئی کچھ مچھلیوں کی قسموں کو بھی رکھا گیا ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ کولکاتا کا یہ سائنسی شہر نہایت سائنسی معلومات سے بھرا پڑا ہے جسے دور دور سے ملکی لوگ اور ملک سے باہر سے آئے ہوئے لوگ دیکھنے آتے رہتے ہیں۔ یہ پورے سال کھلا رہتا ہے صرف ایک دن ہولی پر بند رہتا ہے۔ اگر آپ کولکاتا کبھی جائیں تو اس سائنسی شہر کو دیکھنا نہ بھول جائیے گا اور بچوں کے لیے تو یہ بنا ہی ہے تاکہ اُن کے اندر سائنسی سوچ اور مزاج پیدا ہوسکے۔

■

Mohammad Khalil (Scientist)
H-51, Dr. Iqbal Lane
Batla House, New Delhi - 110025

کنہیا لال کپور

بھلا بتائیے تو!

بیگم کہتی ہیں آپ خواہ مخواہ منے کے ماموں کو کوستے ہیں۔ ہمارا اصرار ہے کہ منے کے ماموں کو نہ کوسا جائے تو پھر کسے کوسا جائے۔ آپ ہی انصاف سے کہیے کہ ہم دونوں میں سے کون حق بجانب ہے۔ ہمارا تو سوفی صد خیال ہے کہ اس مصیبت کی تمام تر ذمے داری منے کے ماموں پر عائد ہوتی ہے۔ نہ وہ منے کو اس کی سال گرہ پر 'معلومات کا انسائیکلوپیڈیا' تحفے میں دیتے۔ نہ منا اسے پڑھنے کے بعد ہم سے طرح طرح کے سوال کرکے ہمیں جاہل ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ منا ٹھہرا ایک دم کتابی کیڑا۔ اس نے صرف تین چار دنوں میں 'معلومات کا انسائیکلوپیڈیا' ختم کرڈالی، اس پر ستم یہ کہ وہ جو پڑھتا ہے اسے جھٹ یاد ہوجاتا ہے۔

کتاب پڑھنے کے بعد اس کے سر میں یہ سودا سمایا کہ اپنے بڑوں کا امتحان لیا جائے یعنی اس بات کی تحقیق کی جائے کہ یہ بزرگ قسم کے لوگ جو اپنے کو عالم و فاضل سمجھتے ہیں دراصل کتنے پانی میں ہیں۔ ہم اخبار کا مطالعہ کررہے تھے کہ کمرے میں داخل ہونے کے بعد منا نے سوال کیا۔

''ڈیڈی۔ بھلا پنسلین کس نے ایجاد کی تھی۔''

ہم گھبرا سے گئے، یہ صحیح ہے کہ بارہا ہم نے پنسلین کے ٹیکے لگوائے ہیں اور ٹیکہ لگواتے وقت ڈاکٹر کے علاوہ پنسلین کے موجد کو بھی دل ہی دل میں برا بھلا کہا ہے لیکن اس بات کے سراغ لگانے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ وہ بھلا مانس تھا کون جس نے اسے ایجاد کیا کہ امرت دھارا کی طرح ہر مرض کا واحد علاج ہے لیکن ہمیں منے کے سوال کا کچھ تو جواب دینا تھا۔ کیونکہ ہم نے خود ہی اسے کئی بار نصیحت کی تھی ''بیٹا زیادہ سے زیادہ سوالات پوچھا کرو، اس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔'' ہم نے ایک آدھ منٹ سوچنے کے بعد کہا ''پنسلین ڈاکٹر الہ دین کی ایجاد ہے۔''

منے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ''واہ ڈیڈی۔ آپ مجھے بنا رہے ہیں۔ جناب پنسلین کا موجد سرالیگزینڈر فلیمنگ ہے۔''

ہم خفیف سے ہوگئے۔ اتنے میں منے نے دوسرا سوال داغ دیا ”اچھا بھلا بتایئے کہ دھنک میں سات رنگ کیوں ہوتے ہیں،“ ”اس لیے کہ وہ خوبصورت لگے۔“

”سات سات رنگ ہی کیوں، چودہ یا اکیس کیوں نہیں۔“

”شاید اس لیے کہ قدرت اتنی فضول خرچ نہیں۔“

”اچھا تو یہ سات رنگ کیسے بنتے ہیں۔“

”بیٹا یہ سب خدا کی باتیں ہیں۔ انھیں خدا ہی جانتا ہے۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نہیں جانتے۔ اچھا میں بتاؤں۔“

”ہاں بتاؤ۔“

”دیکھیے بارش ہو چکنے کے بعد پانی کے کچھ قطرے ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں۔ جب ان میں سے سورج کی سفید کرنیں گزرتی ہیں تو وہ سات رنگوں میں بٹ جاتی ہیں، یقین نہ آئے تو دیکھیے ’معلومات کا انسائیکلوپیڈیا، صفحہ 25‘۔

”اگر اس میں ایسا لکھا ہے تو ایسا ہی ہوگا۔“

”اچھا بھلا بتایئے ’ٹنگ سٹین‘ کیا ہوتی ہے؟“

”ہمارے خیال میں کسی چینی شاعرہ کا نام ہے۔“

”بالکل غلط۔“

”تو پھر کوئی جھیل ہوگی۔“

”یہ بھی غلط“

”سر بسر غلط۔“

”معلوم نہیں کیا بلا ہوتی ہے۔“

”تعجب، آپ کو اتنا بھی پتہ نہیں ’ٹنگ سٹین‘ اس دھات کو کہتے ہیں جو بجلی کے بلب میں ہوتی ہے اور جو گرم ہونے کے بعد روشنی دینے لگتی ہے۔“

”اچھا منا تم اب باہر جا کر کھیلو ہمیں اخبار پڑھنے دو۔“

”صرف ایک سوال اور... اچھا یہ بتایئے کہ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ کون سا ہے اور اس کا رقبہ کتنا ہے؟“

”ہمارے خیال میں لنکا یا سارڈینیا۔“

”حسب معمول غلط۔“

”اچھا تم بتاؤ۔“

”گرین لینڈ۔ رقبہ 840000 مربع میل۔ حوالہ کے لیے دیکھیے ’معلومات کا انسائیکلوپیڈیا، صفحہ 15‘۔

منا فتح یابی کے ڈنکے بجاتا ہوا باہر چلا گیا۔ ہم سوچنے لگے۔ آج ساری شیخی کرکری ہو گئی۔ چاروں سوالوں میں سے ایک کا بھی صحیح جواب نہ دے سکے۔ چند دنوں کے بعد ہم دوستوں کو بر سبیل تذکرہ بتا رہے تھے کہ نپولین نے ایک بار کہا تھا ”واٹرلو کی جنگ ایٹن کے کھیل کے میدانوں میں جیتی گئی“ بدقسمتی سے منے نے ہماری بات سن لی اور فوراً اس کی تردید کرنے کے لیے کمرے میں آدھمکا ”معاف کیجیے ڈیڈی۔ یہ قول نپولین کا نہیں اس کے فاتح ڈیوک آف ولنگڈن کا ہے۔ حوالہ کے دیکھیے ’معلومات کا انسائیکلوپیڈیا، صفحہ 24‘۔

ہمارے دوستوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور ہم پر چھ گھڑوں پانی پڑ گیا، چند اور دنوں کے بعد ہمیں منے کے ہیڈ ماسٹر کی طرف سے ایک خط ملا۔ لکھا تھا:

''جناب من! آپ کے منے نے دن رات اپنے اسکول ماسٹروں سے عجیب وغریب سوالات پوچھ پوچھ کر ان کا دم ناک میں کر دیا ہے۔ ان میں سے دو ایک نے تو دھمکی دی ہے کہ اگر منے کو نہ روکا گیا، تو ملازمت سے استعفیٰ دے دیں گے۔ براہ کرم منے کو سمجھایئے کہ وہ اپنے استادوں پر رحم کرے۔''

ہم نے منے کو بلا کر پوچھ گچھ کی تو اس نے اپنی صفائی میں کہا ''ڈیڈی ہمارے ماسٹروں کو تو کچھ بھی نہیں آتا۔ وہ بے چارے تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ہیلیم (Helium) کس لیے استعمال کی جاتی ہے اور سٹیتھوسکوپ کس نے ایجاد کی تھی۔''

''یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں'' ہم نے کہا۔

''واہ! آپ اتنا بھی نہیں جانتے۔ ساری دنیا جانتا ہے کہ ہیلیم ایک ہلکی سی گیس ہے جسے مریض کو بے ہوش کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور سٹیتھوسکوپ رینی تھیوفائل لینک نے ایجاد کی تھی۔''

''بہر حال تمھیں ایسے سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں۔''

''ضرورت کیوں نہیں۔ جب ماسٹر صاحبان کو ہمارا امتحان لینے کا حق ہے تو ہمیں بھی ان کا امتحان لینے کا حق ہونا چاہیے۔''

بڑی مشکل سے اسے سمجھایا کہ ماسٹر صاحبان ایسی باتیں پسند نہیں کرتے آئندہ تم جو سوال بھی چاہو، ہم سے پوچھ سکتے ہو، کہنے کو تو ہم نے کہہ دیا لیکن اچھی خاصی مصیبت مول لے لی۔ اب منا ہر روز ہم پر جرح کرنے لگا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ فلاں ملک کا رقبہ کتنا ہے۔ چاند زمین سے کتنی دور ہے، چاند گرہن کیوں لگتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ شروع میں ہم نے اس کے سوالوں کے غلط سلط جوابات دینے کی کوشش کی لیکن جب اس نے ہمارے ہر جواب کا مذاق اڑایا تو ہم نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ مثال کے طور پر منے نے پوچھا:

''دنیا کی کل آبادی کتنی ہے؟''

''ہمیں معلوم نہیں، کوئی اور سوال پوچھو۔''

''دنیا کی سب سے بڑی جھیل کا کیا نام ہے؟''

''خدا جانے کیا ہے۔ کوئی اور سوال کرو۔''

''عمر خیام ارسطو سے کتنے سال بعد پیدا ہوا تھا؟''

''معلوم نہیں۔ اگلا سوال پوچھو۔''

''قطب الدین ایبک کو ایبک کیوں کہتے ہیں؟''

''یہ بھی معلوم نہیں، کوئی اور سوال پوچھو۔''

''باٹی سیلی کون تھا؟''

''کوئی ہوگا۔ اس سے اگلا سوال پوچھو۔''

''پولینڈ کا دار الخلافہ بتایئے۔''

''پولینڈ کا دار الخلافہ... ہے.... وہ.... یعنی... اچھا اب جاؤ پڑھو لکھو۔ باقی سوال کل پوچھ لینا۔''

ہم نے سمجھا کہ یہ چال چل کر ہم نے منے کو لاجواب کر دیا ہے لیکن ہماری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب ہم نے منے کو ایک دن اپنے دوستوں سے یہ کہتے ہوئے سنا ''صاحب عجیب مصیبت ہے۔ کوئی کرے تو کیا کرے۔ علمیت کا تو گویا جنازہ ہی نکل گیا ہے۔ والدین تو جاہل اور ماسٹر صاحبان جاہل تر۔ اب کوئی کس سے تعلیم حاصل کرے۔ پڑھانے والے ہی لد گئے!''

■

رونق جمال

چالاک مصور

یہ گزرے زمانے کی بات ہے۔ جب بادشاہ اور راجہ ہوا کرتے تھے۔ ایک راجہ تھا جس کی صرف ایک ٹانگ تھی اور ایک آنکھ تھی۔ لیکن اس کی حکومت میں تمام رعایا خوش حال تھی کیونکہ راجہ نہایت ذہین اور سخت مزاج تھا۔ اس کے فیصلے سخت لیکن بھلائی کے حق میں ہوا کرتے تھے۔ تھا وہ راجہ لیکن عام لوگوں کی سی زندگی گزارتا تھا جس کی وجہ سے وہ ہر پل رعایا کے قریب ہوتا تھا۔ خاص و عام ہر وقت اس سے مل سکتے تھے۔ وہ ضرورت مندوں کی سننے اور ان کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔

ایک دن راجہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ میں اپنی شاندار تصویر بنوا کر دربار میں لگاؤں۔ راجہ نے اپنا خیال اپنے وزیروں اور مشیروں سے بیان کیا تو تمام وزیروں اور مشیروں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا..... ہاں ہاں راجہ صاحب آپ کی شاندار تصویر دربار میں لگنی چاہیے۔ پھر کیا تھا ملک و بیرون ممالک سے مصور حضرات کو راجہ کی تصویر بنانے کے لیے مدعو کیا گیا۔ دنیا کے کونے کونے سے بڑے بڑے نامور مصور راجہ کا نام سن کر بڑے انعام اور اکرام کی لالچ میں راجدھانی پہنچنے لگے۔ راجہ نے بھرے دربار میں مصوروں کے سامنے ایک پیر پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ تمام مصور اس کی شاندار اور خوبصورت تصویر بنائیں۔ جس بھی مصور کی تصویر سب سے اچھی ہوگی اس کی تصویر کو راج محل کے اسی دربار میں لگایا جائے گا اور اس مصور کو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ اُسے اسی حکومت میں جاگیر و عہدہ عطا کیا جائے گا اور وہ راج درباری مصور کہلائے گا۔

تمام مصور حضرات راجہ کا اعلان سن کر سوچنے لگے کہ راجہ تو پہلے سے ہی ایک ٹانگ سے لنگڑا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک آنکھ بھی نہیں ہے۔ پھر اس ادھورے راجہ کی خوبصورت تصویر کیسے بنائی جا سکتی ہے—! ایک اندھے لنگڑے راجہ کی

خوبصورت تصویر بنانا ممکن نہیں ہے!! اگر ہم نے تصویر بنائی اور وہ راجہ کو پسند نہیں آئی تو یہ سخت اور بددماغ راجہ ہمیں سزا دے گا...!! نا بابا..... نہیں بنائی ایسے راجہ کی تصویر ہمیں.....!! یہ سوچ کر دربار سے مصور حضرات اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہاں صرف ایک مصور رہ گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر راجہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور راجہ کو سر سے پیر تک دیکھنے کے بعد مسکرایا اور بولا..... مہاراج میں آپ کی خوبصورت تصویر بناؤں گا! مجھے یقین ہے میری بنائی گئی تصویر آپ کو بے حد پسند آئے گی اور اس عالی شان دربار کے دیوار کی زینت بنے گی۔ مہاراج میرے رہنے کھانے پینے کا انتظام کروا دیں اور ایک بڑا سا کمرہ مجھے دے دیں جہاں میں مہاراج کی تصویر بنانے کی کوشش اطمینان سے کرسکوں۔ راجہ مصور کی بات سن کر اور اس کا حوصلہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ حکم جاری کر دیا کہ..... مصور کے محل میں ٹھہرنے کا انتظام کیا جائے اور ایک بڑا سا کمرہ مصور کو دیا جائے۔

راجہ کے حکم کے مطابق مصور کو ایک بڑا سا کمرہ دے دیا گیا اور اس کے محل میں ٹھہرنے اور کھانے پینے کا انتظام کر دیا گیا۔ مصور دن رات محنت سے راجہ کی تصویر بنانے میں مصروف ہو گیا۔ چند دنوں بعد جب تصویر بن کر تیار ہو گئی تو مصور نے راجہ کو جا کر بتایا کہ..... مہاراج تصویر بن کر تیار ہو گئی ہے۔ آپ دربار لگائیں میں تصویر کی نقاب کشائی دربار میں کرنا چاہتا ہوں تا کہ آپ کے وزیر جاگیردار نواب اور تمام مصور ایک ساتھ میری بنائی ہوئی آپ کی خوبصورت تصویر کو دیکھ سکیں! راجہ کے حکم سے دربار لگایا گیا۔ دربار کھچا کھچ بھرا تھا۔ سب کی نظریں نقاب کے اندر چھپی راجہ کی تصویر دیکھنے کے لیے بیتاب تھیں۔ مصور نے راجہ سے اجازت لی اور تصویر سے نقاب ہٹائی تو دربار میں موجود ہر شخص نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔ تمام مصور حضرات بھی حیرت سے کھڑے ہو کر تصویر کو دیکھنے لگے اور دل ہی دل میں مصور کے فن کو داد دینے لگے۔ راجہ بھی اپنی خوبصورت اور عالی شان تصویر کو دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ راجہ نے آگے بڑھ کر مصور کو گلے سے لگا لیا۔

مصور نے جو شاندار تصویر بنائی تھی وہ کچھ اس طرح تھی کہ راجہ ایک پیر موڑ کر زمین پر بیٹھا ہے۔ دونوں ہاتھوں میں اس زمانے کی وزن دار بندوق ہے۔ راجہ کی ایک آنکھ بند ہے سامنے شیر ہے اور راجہ شیر کو اپنا نشانہ بنا رہا ہے۔ راجہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ مصور نے کس خوبصورتی سے اس کے تمام عیبوں کو ہنر میں بدل کر شاندار تصویر بنائی ہے۔ راجہ نے وعدے کے مطابق مصور کو انعام واکرام کے علاوہ جاگیر بھی عطا کی اور اسے دربار میں اعلیٰ مقام بھی عطا کیا۔

بچو! کہانی سے سبق ملتا ہے کہ اگر انسان عقل سے کام لے تو دنیا میں کوئی کام بھی ناممکن نہیں ہے۔ مصور نے عقل سے کام لیا شاندار تصویر بنائی اور شاہانہ زندگی گزارنے لگے۔ اس لیے زندگی میں آپ کو بھی ہمیشہ عقل سے کام لینا ہے کبھی بھی ہمت اور حوصلہ نہیں ہارنا ہے۔ عقل کے ذریعے آگے بڑھنا ہے اور بہت آگے جانا ہے۔ اپنے لیے اپنے ملک کے لیے کچھ ایسا کرنا ہے جس سے آپ کا نام بھی ہو آپ کے شہر کا نام بھی ہو ملک کا فائدہ بھی ہو اور رہتی دنیا تک لوگ آپ کو یاد رکھیں۔

■

Ronaq Jamal
'Kaaenaat' Street No.: 9,
New Adarsh Nagar
Durg - 491001 (Chattisgarh)

سید لطف اللہ گورکھپوری

محنت رائیگاں نہیں جاتی

جس دن گاؤں کے مڈل اسکول کا رزلٹ آیا اور پورے اسکول میں ٹاپ کر کے ستیہ پرکاش گاؤں کا ہیرو بنا، اسی دن اس کے باپ رام پرکاش جی کا، جو پرائمری اسکول کے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے، انتقال ہوا۔ پوری بستی سوگ میں ڈوب گئی، کیونکہ اپنی انکساری اور خوش اخلاقی سے انھوں نے بستی کے لوگوں کا دل جیت رکھا تھا۔ وہ پچھلے دو ماہ سے بیمار چل رہے تھے۔ انھیں سانس پھولنے کا عارضہ تھا اور سینے کی جکڑن کی وجہ سے وہ کافی تکلیف میں تھے۔ کھانا پانی بھی بند ہو گیا تھا۔ ستیہ پرکاش نے ان کے دوا علاج اور دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی، پھر بھی الٹی پڑ گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ رام پرکاش جی سورگ سدھار گئے۔ ماں کا انتقال پہلے ہو چکا تھا۔ ستیہ پرکاش اب اس دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ باپ سے بچھڑنے کا اس کے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ چند دنوں تک نیم پاگلوں کی سی حالت میں رہا۔

اب اس کے سامنے دو سنگین مسئلے تھے۔ پہلا یہ کہ روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے نئے نئے وسائل کی تلاش اور دوسرا یہ کہ گاؤں میں مڈل کے بعد آگے کی پڑھائی کا کوئی انتظام نہ ہونے کی وجہ سے بغل کے گاؤں میں جا کر وہاں کے اسکول میں نام لکھوانا یا پھر کسی شہر کا رخ کر کے کسی کالج میں ایڈمیشن لینا۔ یہ دوسری تجویز زیادہ پرکشش تھی، اس لیے شہر جا کر وہاں تعلیم حاصل کرنے کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے اس نے بنارس شہر کا انتخاب کیا۔

اپنے کمرے میں رکھے باکس کو الٹ پلٹ دیکھا تو اُس میں سے تیس روپ نکل آئے، جو بنارس کے سفر کے لیے کافی تھے۔ اس نے ایک جھولے میں سامان رکھا اور ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ دیر رات کو ٹرین سے بنارس پہنچا۔

بنارس کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے اس کی نظر ایک نیم پلیٹ پر پڑی، جس پر لکھا ہوا تھا ''انجینئر آفتاب عالم خاں'' کسی غیبی طاقت نے اُس کا رخ اُس بنگلے کی طرف موڑ دیا۔ چند منٹ کے بعد دروازے کے درمیان میں ایک بھاری بھرکم

شخصیت نظر آئی۔ ستیہ پرکاش نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا ”میرا نام ستیہ پرکاش ہے۔ میں نے گورکھپور کے ایک گاؤں کے مڈل اسکول میں ٹاپ کیا ہے، لیکن گاؤں میں آگے کی پڑھائی کا کوئی انتظام نہ ہونے کی وجہ سے میں بنارس میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا اور پھر ڈاکٹر بن کر غریبوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

”اچھا تو تم میرے ہم وطن ہو، میں بھی گورکھپور کے محلّہ میر شکار پور کا رہنے والا ہوں۔ ملازمت کے سلسلے میں یہاں مقیم ہوں۔ قدرت تمھارے اوپر بہت مہربان ہے۔“

”وہ کیسے چاچا جی؟“

”وہ ایسے کہ جس دروازے پر تم نے دستک دی ہے، اس سے کبھی کوئی سوالی مایوس ہو کر نہیں لوٹتا۔“ یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور ستیہ پرکاش سے بھی کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا۔ وہ ڈر کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

”تمھارے مسئلے کا حل بہت آسان ہے، لیکن پہلے تم کچھ کھا پی لو، پھر آگے کی باتیں ہوں گی۔“ اتنا کہہ کر انھوں نے ملازم کو آواز دی ”لیکن انجینئر چاچا میں کھا پی کر نکلا ہوں۔“

”یہی تو تم نے غلطی کی ہے۔ اس د
پر آنے والا کوئی ناشتہ کر کے نہیں آتا اور
جاتا ہے تو اسے دوبارہ ناشتہ کرنا پڑتا
مسافر ہو، میرے ہم وطن ہو، اس لیے کھلا
فرض ہے، احسان نہیں۔“ اتنے میں ملا
ناشتے کی ٹرے میز پر لا کر رکھ دی۔

ستیہ پرکاش تیز تیز ہاتھ چلانے لگا
ساری پلیٹیں خالی ہو گئیں۔ ملازم نے پانی

میز پر لا کر رکھا اور خالی ہو چکی ٹرے واپس لیتا گیا۔ انجینئر آفتاب عالم خاں نے ستیہ پرکاش کی پیشانی پر ذہانت کی لکیریں دیکھتے ہوئے کہا ”تم ایک دن ضرور اپنے گاؤں اور گھر خاندان کا نام روشن کرو گے۔ مجھے بھی اس بات کا فخر ہوگا کہ میرے تعاون سے گاؤں کا ایک لڑکا ڈاکٹر بن گیا۔ اس سلسلے میں میں تمھاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ یہ بھی سن لو۔ اس بلڈنگ کے اسٹور روم میں کافی جگہ خالی پڑی ہوئی ہے۔ اس میں تمھارے رہنے کا انتظام ہو جائے گا۔ صبح دوپہر اور شام کا ناشتہ اور کھانا ملازم تمھارے کمرے میں پہنچا دیا کرے گا۔ اوپری خرچ کے لیے تم دو تین ٹیوشن کر لینا۔ اس طرح تمھاری کامیابی میں تمھاری اپنی محنت اور جدوجہد کا حصہ بھی شامل رہے گا۔“

”انجینئر چاچا آپ انسان نہیں دیوتا ہیں۔ میں آپ کا اپکار اگلے جنم میں بھی نہیں بھولوں گا، پھر بھی کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے میں دو تین دن گھوم پھر کر یہاں کے ماحول کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہتا ہوں تاکہ بعد میں کسی غلطی کا احساس نہ ہو۔“

"یہ تم نے بڑی سمجھداری کی بات کہی ستیہ پرکاش۔ تم یقیناً ایک دن اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے۔"

انجینئر چاچا کا شکریہ ادا کر کے وہ باہر نکلا اور اسے شہر کے علاقوں کا چکر لگاتے ہوئے تھک کر ایک سائے کے کنارے ایک عمارت کے لان میں لگے درخت کے سائے تلے بیٹھ گیا۔ اُسے نیند آگئی۔ نیند میں اسے ایک آواز سنائی دی "بیٹا! پریشان کیوں ہو۔ تمھارے گھر سے اُتر کی جانب ایک میل کے فاصلے پر زمین کے ایک بڑے ٹکڑے پر مہوے کا ایک تناور درخت ہے، جو کبھی تمھارے باپ دادا نے اسی دن کے لیے لگایا تھا۔ یہ اب تمھاری ملکیت ہے۔ گاؤں کے سبھی لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں۔ تم میرے دوست ،کرپاشنکر جی سے مل لینا اور ان کے تعاون سے زمین سمیت مہوے کے درخت کو فروخت کر دینا۔ اِس سے تمھیں اتنی رقم مل جائے گی، جو تمھارے لیے بنارس میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کافی ہوگی اور پھر تم خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو چکے ہو گے۔" غیب سے آنے والی آواز ڈوب گئی۔ ستیہ پرکاش کے دماغ میں ایک پرسکون سناٹا چھا گیا۔ وہ اسی حالت میں پڑا تھا کہ ٹرین کی آمد کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کپڑے جھاڑے اور ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیا۔

گاؤں پہنچ کر وہ سب سے پہلے کرپاشنکر جی سے ملا اور انھیں سارے حالات اور واقعات سے واقف کرا کر اُن سے مدد کی درخواست کی۔ کرپاشنکر جی نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور ہر طرح کی مدد کا یقین دلایا۔ پھر ان کی تین چار دن کی کوششوں کے نتیجے میں مہوے کا پیڑ زمین سمیت بک گیا۔ اس سے اتنی زیادہ رقم حاصل ہوئی، جس کی ستیہ پرکاش نے امید نہ کی تھی۔ ضرورت کے مطابق رقم اپنے پاس رکھ کر بقیہ رقم اُس نے کرپاشنکر جی کے پاس بطور امانت رکھوا دیا اور مکان میں تالا بند کر کے اس کی چابی بھی ان کے حوالے کر کے وہ خود بنارس لوٹ آیا۔

یہاں پہنچ کر اس نے رہنے کا انتظام کیا۔ پھر اس نے اپنے ایڈمیشن کے لیے دوڑ دھوپ شروع کی۔ کئی جگہ ناکامی کا منہ دیکھنے کے بعد بالآخر اسے ایک انٹر کالج میں داخلہ مل گیا۔

جوابات

ہر میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے اس نے بی۔ ایس۔ سی کے بعد ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کر لیا اور ایک اعلیٰ درجے کی سرکاری ملازمت بھی حاصل کر لی۔ خاطر خواہ رقم اکٹھا ہو جانے کے بعد اس نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر گورکھپور میں اپنا کلینک کھولنے کا فیصلہ کیا۔ اگر چہ اس کے اس فیصلہ کی اطلاع اس کے انجینئر چاچا کو پہلے سے تھی، پھر بھی بنارس چھوڑنے سے پہلے وہ ان سے ملنے ان کی رہائش گاہ پر گیا، مگر وہاں ملازم سے معلوم ہوا کہ وہ اچانک چھٹی پر گورکھپور چلے گئے ہیں۔ ''کوئی بات نہیں'' اس نے سوچا ''وہیں ملاقات ہو جائے گی۔''

یہاں اس کے ایک واقف کار نے اس کے لیے پہلے ہی سے رائے گنج روڈ پر ایک ایسا مکان کرائے پر طے کر رکھا تھا، جس کے ایک حصے کو رہائش گاہ کے روپ میں اور دوسرے حصے کو کلینک کے روپ میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ستیہ پرکاش نے ایک مہینہ کا ایڈوانس کرایہ ادا کر کے ایجنٹ سے مکان کی چابی حاصل کر لی۔ سب سے پہلے اس نے مکان کی صفائی کرائی اس کے بعد مکان کے باہری حصے پر کلینک کا بورڈ لگوایا۔ پھر کلینک کو تمام ضروری دواؤں اور سرجیکل آلات سے لیس کیا۔ فیس دو روپے اور دوائیں دام کے دام رکھیں۔ چونکہ سارے انتظامات قریب قریب مکمل ہو چکے تھے، اِس لیے دوسرے دن سے اس نے کلینک کھولنے کا فیصلہ کیا اور اِس کی اطلاع دینے کے لیے وہ مٹھائی کے ڈبہ کے ساتھ رکشے پر بیٹھ کر انجینئر چاچا کے محلہ کی طرف روانہ ہوا۔ اُسی وقت وہ کہیں جانے کے لیے گھر سے باہر نکل رہے تھے۔ ستیہ پرکاش کو اپنے دروازے پر دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اسے ساتھ لے کر اندر اپنے کمرے میں آئے۔ دونوں نے مٹھائی کے ڈبہ سے مٹھائی نکال کر کھائی اور فریج کا پانی پی کر تازہ دم ہوئے۔

''تمھاری کلینک کب سے کھل رہی ہے ستیہ پرکاش؟''

''میں یہی اطلاع دینے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں کہ میری کلینک کل صبح آٹھ بجے کھل جائے گی۔ پہلا دن ہوگا، اس لیے آپ کی موجودگی میرے لیے بہت بڑا سہارا ہوگی۔''

''میں ہر حالت میں پہنچ جاؤں گا۔ اطمینان رکھو۔'' یہ سن کر ستیہ پرکاش چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

دوسرے دن کلینک کھلتے کھلتے انجینئر چاچا بھی وہاں پہنچ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور ستیہ پرکاش نے انجینئر چاچا کو اپنے برابر میں بیٹھاتے ہوئے کہا ''میں، زندگی کے ہر موڑ پر ساتھ دینے کے لیے آپ کے احسان کو کبھی نہیں بھولوں گا۔'' پھر اس طرح آپس میں بات چیت کرتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹے گزر گئے۔ سڑک پر چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ ایک کے بعد ایک دو مریض کلینک میں آئے اور شام تک کل ملا کر گیارہ مریض آئے۔ رفتہ رفتہ مریضوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ ستیہ پرکاش کا مقصد پیسہ کمانا نہیں، بلکہ خدمت خلق تھا۔ غریب مریض اسے اپنا مسیحا سمجھتے تو دولت مند مریض اس کی کلینک میں آنا اپنی توہین سمجھتے۔ کچھ اسے پاگل کہتے تو کچھ کا کہنا تھا کہ اس کی ڈگری ہی فرضی ہے اور وہ غریب مریضوں کو بیوقوف بنا رہا ہے، مگر ان سب تبصروں سے بے نیاز وہ اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا اور شہر کے اچھے ڈاکٹروں میں شمار ہونے لگا۔

■

Syed Lutfullah
Sangi Masjid, Shikhpur
Gorakhpur - 273005 (UP)

سید پرویز قیصر

پہلے ہی یک روزہ بین الاقوامی میچ میں سنچری

یک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں ابھی تک 346 بلے بازوں نے 1498 سنچریاں اسکور کی ہیں۔ ان 346 بلے بازوں میں سے گیارہ بلے باز اپنے پہلے ہی یک روزہ بین الاقوامی میچ میں سنچری بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔

ہندوستان کے لوکیش راہل نے اپنے پہلے یک روزہ بین الاقوامی میچ میں 176 منٹ میں 115 بالوں پر 7 چوکوں اور ایک چھکے کی مدد سے آؤٹ ہوئے بغیر 100 رن بنائے اور اپنی ٹیم کو زمبابوے کے خلاف ہرارے میں 9 وکٹ سے کامیابی دلائی۔

دائیں ہاتھ سے بلے بازی کرنے والے لوکیش راہل ایک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں پہلے ہی میچ میں سنچری اسکور کرنے والے ہندوستان کے پہلے کھلاڑی بنے۔

یک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں پہلے میچ میں سنچری اسکور کرنے والے پہلے بلے باز انگلینڈ کے ڈینس ایمس تھے جنھوں نے آسٹریلیا کے خلاف مانچسٹر میں 24 اگست 1972 کو کھیلے گئے میچ میں 161 منٹ میں 134 بالوں پر 9 چوکوں کی مدد سے 103 رن بنائے تھے اور اپنی ٹیم کو 6 وکٹ سے فتح دلائی تھی۔ یہ تاریخ کا دوسرا یک روزہ بین الاقوامی میچ تھا اور ڈینس ایمس کی سنچری اس قسم کے کرکٹ میں پہلی تھی۔ اس میچ کے بعد ڈینس ایمس نے تین اور سنچریاں اسکور کیں۔ کل ملا کر انھوں نے 18 یک روزہ بین الاقوامی میچوں میں 4 سنچریاں بنانے میں کامیاب رہے۔

ویسٹ انڈیز کے ڈیسمنڈ ہینس کو پہلے یک روزہ بین الاقوامی میچ میں سب سے بڑی اننگ کھیلنے کا اعزاز حاصل ہے۔ آسٹریلیا کے خلاف سینٹ جونس میں 22 فروری 1978 کو کھیلے گئے میچ میں انھوں نے 136 بالوں میں 16 چوکوں اور دو چھکوں کی مدد سے 148 رن بنائے تھے۔ ڈیسمنڈ ہینس کی اس شاندار سنچری کی بدولت ویسٹ انڈیز نے یہ میچ 44 رن سے جیتا تھا۔

پہلے یک روزہ بین الاقوامی میچ میں سنچری بنانے والے باز

اسکور	بلے باز	مقابلے	مقام	تاریخ
148	ڈیسمنڈ ہینس (ویسٹ انڈیز)	آسٹریلیا	سینٹ جونس	22 فروری 1978
124*	مارک جیپ مین (ہانگ کانگ)	متحدہ عرب امارات	دبئی	16 نومبر 2015
124	کولین انگرام (جنوبی افریقہ)	زمبابوے	بلومفنٹین	15 اکتوبر 2010
122*	مارٹن گپٹل (نیوزی لینڈ)	ویسٹ انڈیز	آکلینڈ	10 جنوری 2009
115*	اینڈی فلاور (زمبابوے)	سری لنکا	نیو پلے ماؤتھ	23 فروری 1992
112	فلپ ہیوز (آسٹریلیا)	سری لنکا	ملبورن	11 جنوری 2013
108*	رابرٹ نکول (نیوزی لینڈ)	زمبابوے	ہرارے	20 اکتوبر 2011
106	مائیکل لیمب (انگلینڈ)	ویسٹ انڈیز	نارتھ ساؤنڈ	28 فروری 2014
103	ڈینس ایمس (انگلینڈ)	آسٹریلیا	مانچسٹر	24 اگست 1972
102*	سلیم الٰہی (پاکستان)	سری لنکا	گوجرانوالہ	29 ستمبر 1995
100*	لوکیش راہل (ہندوستان)	زمبابوے	ہرارے	11 جون 2016

ڈیسمنڈ ہینس نے کل 238 یک روزہ بین الاقوامی میچ کھیلے جن کی 237 اننگوں میں وہ 17 سنچریں اور 57 نصف سنچریوں کی مدد سے 8648 رن بنانے میں کامیاب رہے۔

اینڈی فلاور بھی ان بلے بازوں میں شامل ہیں جنھوں نے اپنے پہلے یک روزہ بین الاقوامی میچ میں سنچری بنائی تھی۔ زمبابوے کے لیے کھیلتے ہوئے سری لنکا کے خلاف نیو پلے ماؤتھ میں 23 فروری 1992 کو کھیلے گئے میچ میں انھوں نے 152 بالوں پر 8 چوکوں اور ایک چھکے کی مدد سے آؤٹ ہوئے بغیر 115 رن بنائے تھے۔ اینڈی فلاور کی اس شاندار سنچری کی مدد سے زمبابوے نے 50 اوور میں 4 وکٹ پر 312 رن بنائے تھے لیکن پھر بھی وہ یہ میچ نہیں جیت سکی تھی۔ سری لنکا نے 49.2 اوور میں 7 وکٹ پر 313 رن بنا کر میچ 3 وکٹ سے جیت لیا تھا۔

اینڈی فلاور نے کل 213 یک روزہ بین الاقوامی میچوں کی 208 اننگوں میں 4 سنچریوں اور 55 نصف سنچریوں کی مدد سے 35.34 کی اوسط کے ساتھ 6786 رن بنائے۔

پاکستان کے سلیم الٰہی نے سری لنکا کے خلاف گوجرانوالہ میں 29 دسمبر 1995 کو کھیلے گئے میچ میں 133 بالوں پر 7 چوکوں اور ایک چھکے کی مدد سے آؤٹ ہوئے بغیر 102 رن بنائے تھے اور پاکستان کو 9 وکٹ سے جیت دلائی تھی۔ پہلے یک روزہ بین الاقوامی میچ میں سنچری بنانے کے بعد سلیم الٰہی تین اور سنچریاں بنانے میں کامیاب رہے تھے۔ کل ملا کر دائیں ہاتھ کے بلے بازی کرنے والے اس افتتاحی بلے باز نے 48 یک روزہ بین الاقوامی میچوں کی 47 اننگوں میں 4 سنچریوں اور 9 نصف سنچریوں کی مدد سے 36.72 کی اوسط

کے ساتھ 1779 رن بنائے ہیں۔

مارٹن گپٹل نے ویسٹ انڈیز کے خلاف آکلینڈ میں 15 جنوری 2009 کو جب اپنا پہلا یک روزہ بین الاقوامی کھیلا تھا تو 201 منٹ میں 135 گیندوں سے 8 چوکوں اور دو چھکوں کی مدد سے 122 رن بنا کر ناوٹ آؤٹ رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے یہ میچ پورا نہیں ہو پایا تھا اور مارٹن گپٹل کی سنچری نیوزی لینڈ کو جیت نہیں دلا پائی تھی۔ دائیں ہاتھ سے بلے بازی کرنے والے مارٹن گپٹل نے ابھی تک 129 یک روزہ بین الاقوامی میچ کھیلے ہیں ان کی 126 اننگز میں 10 سنچریوں اور 30 نصف سنچریوں کی مدد سے 4844 رن بنائے ہیں۔

جنوبی افریقہ کے کولین انگرام نے زمبابوے کے خلاف بلومفنٹین میں 15 اکتوبر 2010 کو کھیلے گئے میچ میں 126 بالوں پر 8 چوکوں اور دو چھکوں کی مدد سے 124 رن بنائے تھے۔ وہ پہلے یک روزہ بین الاقوامی میچ میں سنچری بنانے والے جنوبی افریقہ کے واحد بلے باز ہیں۔ کولین انگرام کی اس شاندار اننگ کی بدولت جنوبی افریقہ نے 50 اوور میں 6 وکٹ پر 351 رن بنائے تھے اور میچ 64 رن سے جیتا تھا۔

بائیں ہاتھ سے بلے بازی کرنے والے کولین انگرام نے ابھی تک جو 31 یک روزہ بین الاقوامی میچ کھیلے ہیں ان کی 29 اننگز میں تین سنچریوں کی مدد سے 843 رن بنائے ہیں۔

زمبابوے کے خلاف ہرارے میں 20 اکتوبر 2011 کو نیوزی لینڈ کے رابرٹ نکول نے جب اپنا پہلا یک روزہ بین الاقوامی میچ کھیلا تھا تو 131 بالوں میں 11 چوکوں کی مدد سے 108 رن بنائے تھے۔ ان کی اس شاندار سنچری سے نیوزی لینڈ کو 9 وکٹ سے کامیابی ملی تھی۔

رابرٹ نکول نے ابھی تک جو 22 یک روزہ بین الاقوامی میچ کھیلے ہیں ان کی 21 اننگز میں دو سنچریوں اور دو نصف سنچریوں کی مدد سے 586 رن بنائے ہیں۔

آسٹریلیا کے فلپ ہیوز نے سری لنکا کے خلاف ملبورن میں 11 جنوری 2013 کو 162 منٹ میں 129 بالوں پر 14 چوکوں کی مدد سے 112 رن بنائے تھے۔

دائیں ہاتھ سے بلے بازی کرنے والے فلپ ہیوز جو 25 یک روزہ بین الاقوامی میچ کھیلے۔ ان کی 24 اننگز میں دو سنچریں اور چار نصف سنچریوں کی مدد سے 826 رن بنائے تھے۔

پہلے ہی یک روزہ بین الاقوامی میچ میں سنچری اسکور کرنے والے انگلینڈ کے دوسرے بلے باز مائیکل لیمب تھے۔ ویسٹ انڈیز کے خلاف نارتھ ساؤنڈ میں 28 فروری 2014 کو کھیلے گئے میچ میں انھوں نے 160 منٹ میں 117 بالوں پر سات چوکوں اور دو چھکوں کی مدد سے 106 رن بنائے تھے۔

بائیں ہاتھ سے بلے بازی کرنے والے مائیکل لیمب نے اس میچ کے بعد دو اور میچ کھیلے لیکن کوئی سنچری اسکور نہیں کی۔

دبئی میں 16 نومبر 2015 کو کھیلے گئے میچ میں ہانگ کانگ کے مارک جیپ مین نے متحدہ عرب امارات کے خلاف 116 بالوں پر 11 چوکوں اور دو چھکوں کی مدد سے آؤٹ ہوئے بغیر 124 رن بنائے تھے۔ دائیں ہاتھ کے اس بلے باز نے اپنے دوسرے میچ میں 27 رن بنائے تھے۔

شاہد آفریدی کو پہلے میچ میں بلے بازی کا موقع نہیں ملا تھا مگر دوسرے میچ میں سری لنکا کے خلاف نیروبی میں 4 اکتوبر 1996 کو انھوں نے سنچری اسکور کی تھی۔

■

Syed Pervez Qaiser
1407, Qasimjan Street, Ballimaran
Delhi - 110006

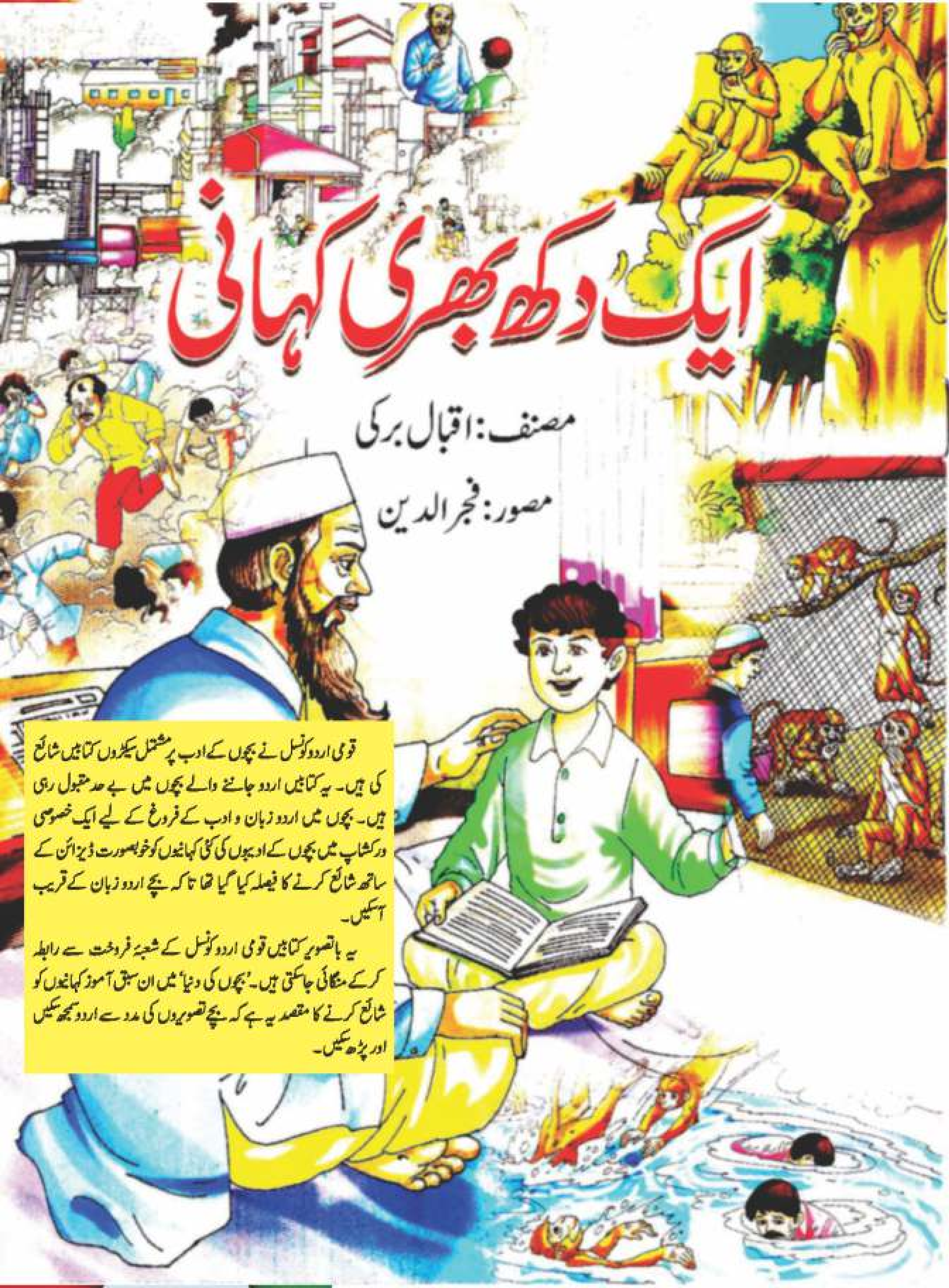

ایک دکھ بھری کہانی

مصنف: اقبال برکی

مصور: فجر الدین

قومی اردو کونسل نے بچوں کے ادب پر مشتمل سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ کتابیں اردو جاننے والے بچوں میں بے حد مقبول رہی ہیں۔ بچوں میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ایک خصوصی ورکشاپ میں بچوں کے ادیبوں کی کئی کہانیوں کو خوبصورت ڈیزائن کے ساتھ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا تاکہ بچے اردو زبان کے قریب آسکیں۔

یہ باتصویر کتابیں قومی اردو کونسل کے شعبۂ فروخت سے رابطہ کرکے منگائی جاسکتی ہیں۔ 'بچوں کی دنیا' میں ان سبق آموز کہانیوں کو شائع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بچے تصویروں کی مدد سے اردو سمجھ سکیں اور پڑھ سکیں۔

جب کچن کی گیس لیک ہوتی ہے تو آپ لوگ کیسے جلدی سے شور مچاتے ہو کیونکہ اس میں ایک قسم کی بو ہوتی ہے۔
بالکل اسی طرح اس فیکٹری سے بھی گیس لیک ہوگئی لیکن آپ کو حیرت ہوگی اس گیس میں کوئی بو نہیں تھی۔
وہ نکلی سے نکلی اور تیزی سے فیکٹری کے اندر اور باہر پھیلتی چلی گئی۔ جیسے ہی وہ گیس بستی میں پھیلی تباہی مچادی۔

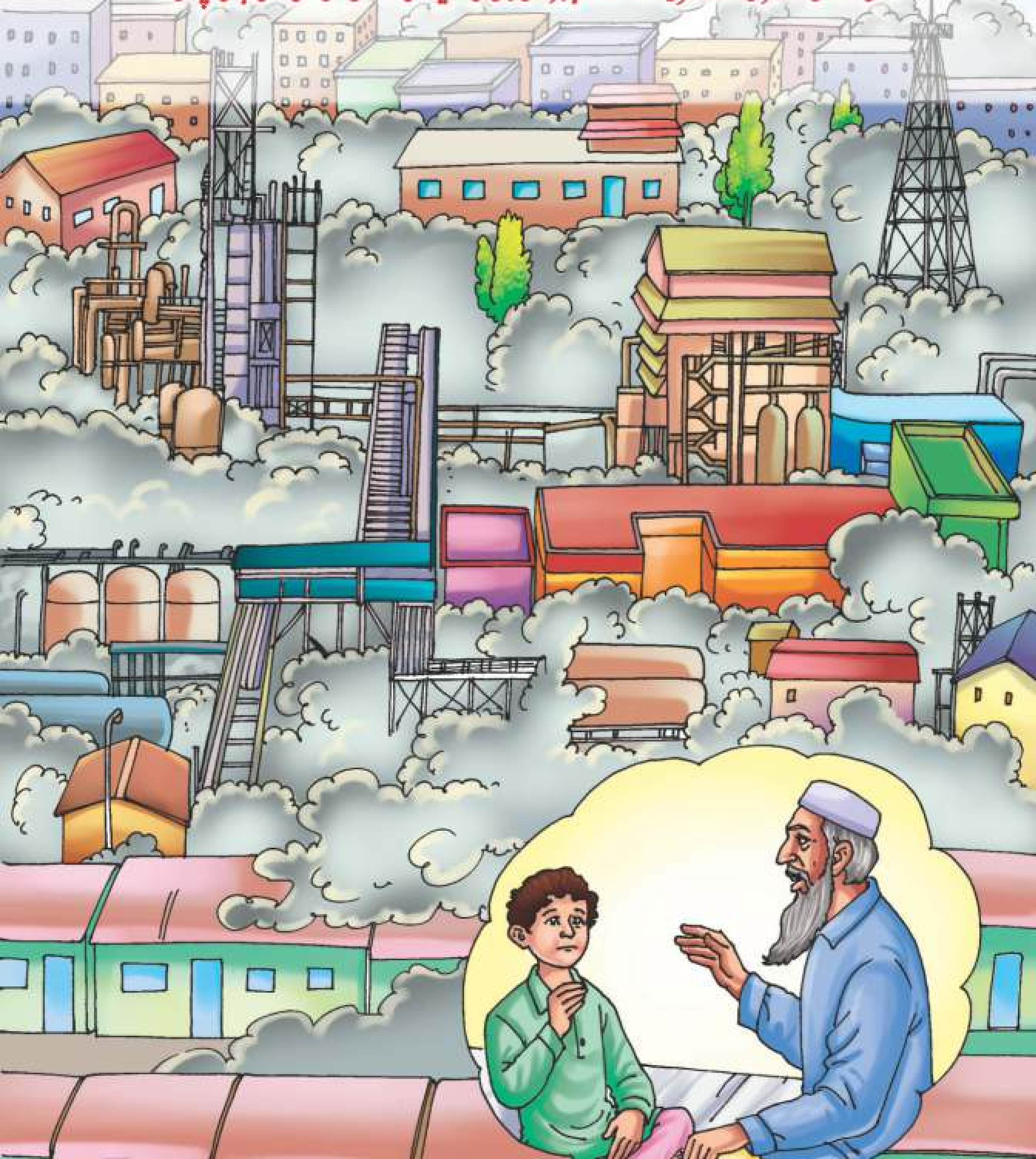

جب وہ گیس لوگوں کی ناک سے ہوتے ہوئے ان کے گلے تک اور گلے سے نیچے ان کے سینوں میں پہنچی تو ان کی سانسوں کی نالیوں اور ان کے پھیپھڑوں کو فوراً خراب کر دیا۔ لوگ تڑپ تڑپ کر فوراً مر گئے۔

اس طرح دیکھتے دیکھتے اس بستی کے ہزاروں لوگ جو رات کو سو رہے تھے سوتے سوتے موت کی نیند سو گئے۔ لیکن جو لوگ جاگ رہے تھے یا تکلیف کی وجہ سے جاگ گئے تھے، اپنی آنکھوں، حلق اور سینوں میں شدید جلن محسوس کر رہے تھے۔ ایسی جلن کہ وہ بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ کچھ لوگ تو اسی بھاگ دوڑ میں مر گئے لیکن کچھ لوگ اسی بھاگ دوڑ کی وجہ سے بچ بھی گئے۔"

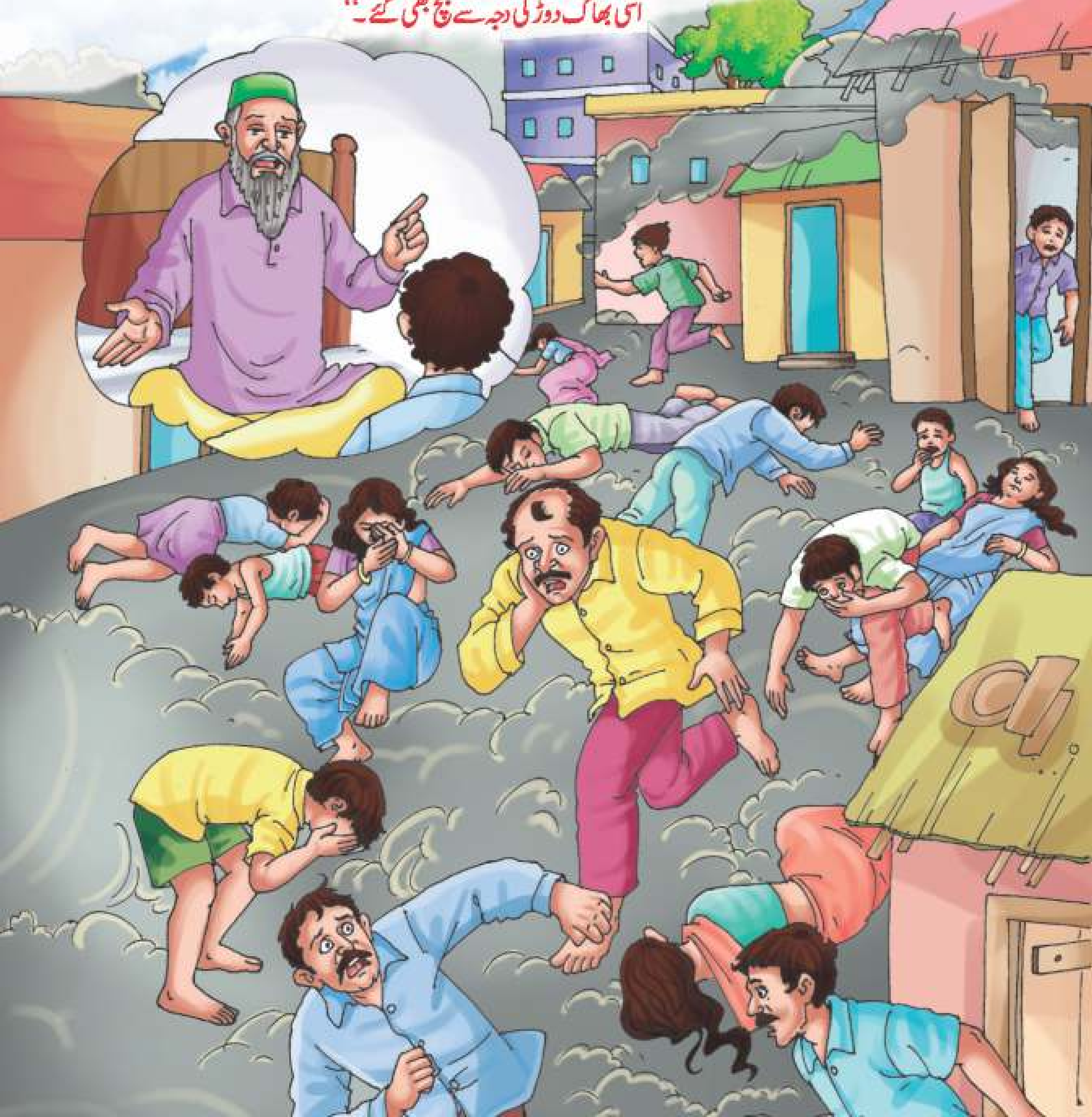

”وہ کیسے ابّو جی؟“ میرے خاموش ہوتے ہی وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

”وہ اس طرح بیٹا............ کہ............ دیکھو پہلے کے بوڑھے تجربہ کار لوگ اکثر کہتے تھے کہ اگر کبھی کسی جنگل میں جانا ہو اور کھانے پینے کا کوئی سامان نہ ہو تو کوئی فکر و پریشانی کی بات نہیں۔ جنگل میں بندروں کو تلاش کرو۔ جنگل میں بندر ہوں تو سمجھو کھانے پینے کا انتظام ہو گیا۔“

”تو کیا ہم بندروں کو کھائیں گے؟“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”نہیں بیٹا۔ بندر کیسے کھائیں گے؟ لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہم بندر پر نظر رکھیں۔ ہم یہ دیکھیں کہ جنگل میں وہ کون سا پھل کھاتے ہیں۔ ہم بھی وہی پھل کھائیں۔ ہو سکتا ہے وہ پھل کھٹا کسیلا یا پھر ذائقہ میں مزے دار نہ ہو۔ لیکن کم از کم ہمارا پیٹ بھر تو جائے گا۔ ہم بھوکے تو نہیں رہیں گے۔ اُن بڑے بوڑھوں نے آخر ایسی نصیحتیں کیوں کی تھیں؟ جانتے ہو اس کی وجہ کیا ہے؟“

...جاری

مصنفہ: جولز ورنی
مترجم: شکیل صدیقی

قسط وار ناول

تیسری قسط

زمین کی تہہ میں

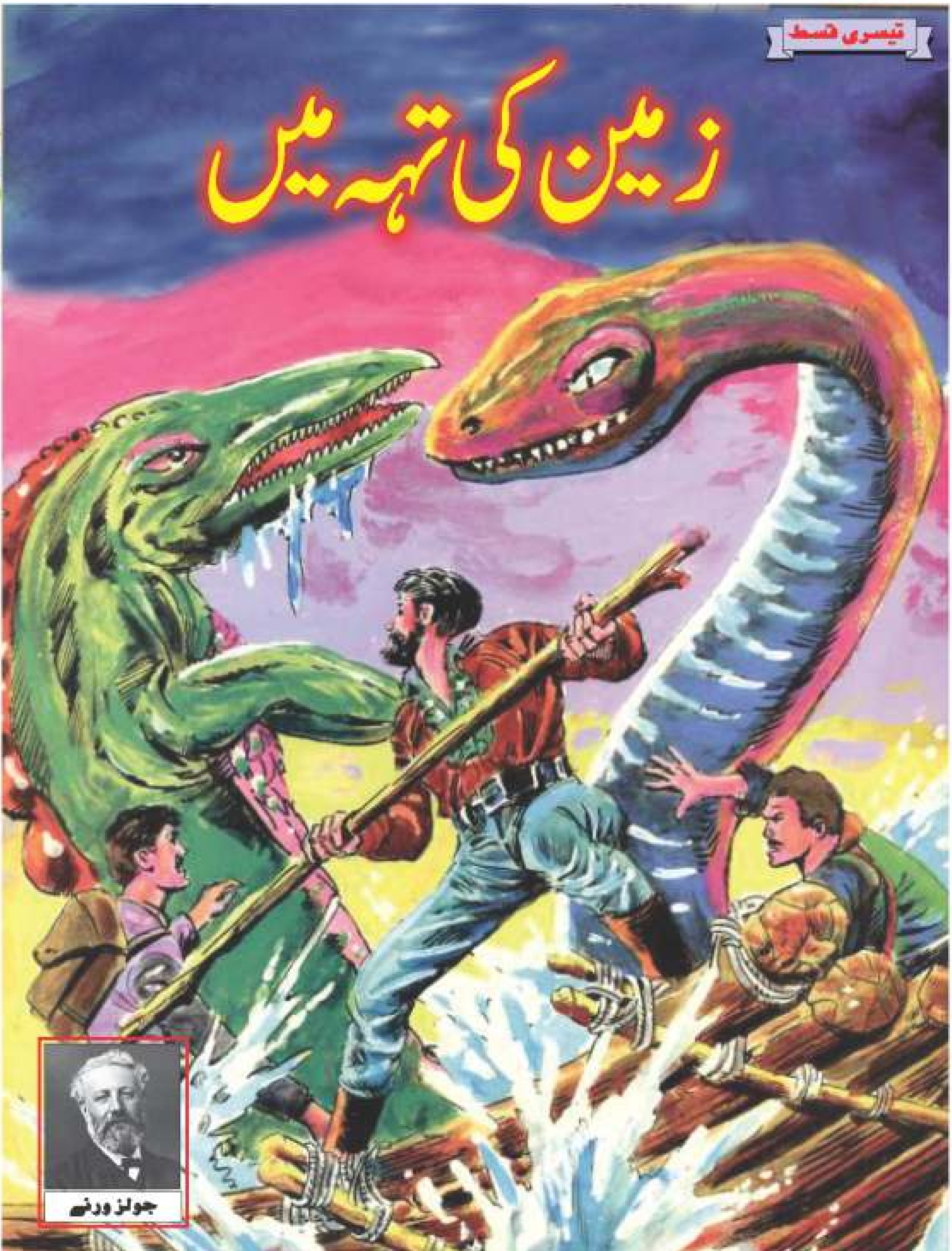

جولز ورنی

ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کو نئے نئے جہانوں کی سیر کرائیں اور ثقافتی، تاریخی و تہذیبی معلومات کے ساتھ ساتھ جغرافیائی، ارضیاتی اور سائنسی معلومات بھی فراہم کریں۔ یہ ناول پہلے فرانسیسی زبان میں 1864 میں لکھا گیا تھا۔ اِس ناول کا ترجمہ اردو سمیت دنیا کی اہم زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اِس ناول کے مصنف جولز ورنے ہیں جو عالمی ادب میں فادر آف سائنس فکشن کے طور پر مقبول ہیں۔ ان کے ایک ناول Around the World in Eighty Days کو بہت زیادہ شہرت ملی تھی جس کو آپ نے 'بچوں کی دنیا' میں قسط وار پڑھا بھی ہے۔ جولز ورنے کے ناول بچوں کے ساتھ بڑوں میں بھی بہت مقبول رہے ہیں۔ انھیں نئے نئے جہانوں کی سیر کرنے اور کرانے میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کے ناولوں پر کئی فلمیں اور ٹیلی سیریل بھی بن چکے ہیں۔ 'زمین کی تہہ میں' ایک ایسا ناول ہے جس میں زمین کے ہزاروں فٹ نیچے کی دنیا کو دکھایا گیا ہے۔ یہ پروفیسر لائیڈین بروک کی کہانی ہے جو ایک پراسرار تحریر کے بعد زمین کی تہہ کے ایک سفر پر نکلتا ہے جس میں اُسے ڈھیر ساری مشکلات پیش آتی ہیں۔ عجیب و غریب جانداروں اور اشیا سے اُس کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ کس طرح زمین کی تہہ تک پہنچتا ہے اور واپس اِس دنیا پر آتا ہے یہی اس ناول کا ماحصل ہے۔ اس میں آپ کو سائنس کی اہم معلومات کے ساتھ ساتھ زمین کے اندر کی عجیب و غریب جانکاریاں بھی ملیں گی۔

اب تک آپ نے پڑھا کہ پروفیسر لائیڈین بروک معدنیات وارضیات کے ماہر تھے۔ وہ بہت قابل شخص تھے اور علاقے میں ان کی کافی عزت تھی، انھیں پرانی کتابوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ایک دن انھیں سات سو سال پرانی کتاب ہاتھ لگی جو آئس لینڈ کی زبان میں تھی۔ پروفیسر بروک اپنے بھتیجے کے ساتھ رہتے تھے۔ چچا بھتیجے نے اس کتاب کی تحریر سمجھنے کی کوشش کی۔ بہت مشکل سے بس وہ کچھ الفاظ ہی سمجھ پائے۔ پروفیسر لائیڈن بروک کہیں چلے جاتے ہیں اور ادھر بھتیجہ اس تحریر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے ہوئے بھی پروفیسر کو بتا دیتا ہے کیونکہ اس میں ایک خطرناک سفر پر جانے کی بات تھی۔ تحریر کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد پروفیسر نے سفر پر جانے کی ٹھان لی۔ بھتیجہ (البرٹ) نہیں چاہتے ہوئے بھی تیار ہو گیا۔ آخر کار دو دن بعد لائیڈن بروک اور البرٹ اِس خطرناک سفر پر نکل گئے۔ سفر کے لیے انھیں کوپن ہیگن پہنچنا تھا اور وہاں سے آئس لینڈ۔ اب آگے

سفر کی ابتدا

ساڑھے چھ بجے ہم اسٹیشن پر پہنچ چکے تھے اور سات بجے ٹرین کے ایک ڈبے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور ہمارا سامان قریب ہی رکھا تھا۔ ٹرین نے سیٹی بجائی اور چل پڑی۔ میں کھڑکی سے وہ منظر دیکھنے لگا جو تیزی سے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ جبکہ چچا جان اپنے بیگ اور پھر جیبیں ٹٹولنے لگے کہ وہ سارے ضروری کاغذات اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں یا نہیں۔ میں نے ان کے ہاتھ میں کھال پر لکھی ہوئی تحریر دیکھ کر منہ بنایا اور دل کی گہرائیوں سے لعنت بھیجی۔

تین گھنٹے بعد ٹرین کائل پہنچ گئی۔ وہاں سے ہم نے بحری جہاز کے ذریعے سفر کیا اور پھر ایک ٹرین سے صبح دس بجے کوپن ہیگن پہنچ گئے۔ وہ 28 مئی کی صبح تھی۔ اسٹیشن سے ہم لوگ ایک ہوٹل چلے گئے۔ چچا جان نے جلدی سے غسل کیا پھر مجھے لے

کر جیٹی پر گئے تا کہ آئس لینڈ جانے والا کوئی جہاز تلاش کر سکیں۔

مجھے توقع تھی کہ ایسا کوئی جہاز نہیں مل سکے گا، مگر اس وقت میں کافی مایوس ہوا جب الکا ئر نامی ڈنمارک کا ایک چھوٹا سا جہاز رکیاوک جانے کے لیے مل گیا جو 2 جون کو وہاں پہنچنے والا تھا۔ پروفیسر اتنے خوش تھے کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ جہاز کا کپتان ہم سے ڈگنا کرایہ نہ وصول کر لے۔ ”تم لوگ منگل کو صبح سات بجے آجانا۔“ اس نے کرایہ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ہم خوش قسمت ہیں کہ اس جہاز میں جگہ مل گئی۔“ چچا جان نے کہا ”اچھا آؤ اب ناشتہ کر لیں اور اس کے بعد کوپن ہیگن کی سیر کریں۔“

ناشتہ کرنے کے بعد میں چچا جان کے ساتھ کسی ننھے بچے کی طرح شہر کی سیر کرتا رہا۔ وہاں حیرت انگیز چیزیں تھیں جنھیں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ میں نے سوچا کاش کہ جولی بھی اس وقت میرے ساتھ ہوتی، مگر وہ تو مجھ سے بہت دور بیٹھی تھی، اور یہ بھی ممکن تھا کہ میں اسے کبھی نہ دیکھ سکوں۔

چچا جان حالانکہ میرے ساتھ تھے، لیکن انھیں شاہی محلوں اور دوسری خوبصورت عمارتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ وہ شہر کے جنوب مغربی حصے میں ایک چرچ کے مخروطی حصے کو دیکھ کر جوش و خروش کا اظہار کرنے لگے۔

میرے نزدیک چرچ میں کوئی انوکھی بات نہیں تھی، مگر پروفیسر کا کہنا تھا کہ چرچ کے مینار تک راستہ بل کھاتا ہوا چلا گیا۔ ”آؤ اس سے چوٹی تک چلتے ہیں۔“ وہ بولے۔ ”آپ چوٹی تک کیوں جانا چاہتے ہیں؟“ میں نے کہا۔

"ہمیں اونچائی تک جانا چاہیے تاکہ ہم اس کے عادی ہو جائیں۔" وہ بولے۔ میں ہچکچایا تو انھوں نے کہا۔ آؤ میرے ساتھ تم وقت ضائع کر رہے ہو۔"

ہم نے اس مینار پر چڑھنا شروع کر دیا۔ چچا جان آگے تھے اور پھرتی سے چڑھ رہے تھے۔ میں سہما ہوا ان کے پیچھے تھا۔ جب تک ہم نیچے تھے اس وقت تک کچھ نہیں ہوا، لیکن تقریباً ڈیڑھ سو قدمچے طے کرنے کے بعد تازہ ہوا کے جھونکے میرے چہرے سے ٹکرانا شروع ہو گئے۔ اب زینے کا وہ حصہ شروع ہو گیا تھا جو بیرونی رُخ پر تھا۔ وہاں قدمچے چھوٹے تھے اور سہارے کے لیے صرف ایک فولادی ریلنگ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ زینہ کہیں خلا میں جا کر گم ہو گیا ہو!

"میں اور اوپر نہیں چڑھ سکتا۔" میں نے کہا۔

"آؤ بزدل کہیں کے۔" پروفیسر بولے۔

مجھے بہرحال ان کے پیچھے جانا تھا۔ میں نے ریلنگ کا سہارا لے رکھا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مینار ہوا کے زور سے ہل رہا ہو! میری ٹانگیں کمزور پڑنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد میری ہمت جواب دے گئی اور میں گھٹنوں کے بل زینے طے کرنے لگا اور اس کے بعد تقریباً لیٹ گیا اور پیٹ کے بل رینگنے لگا۔ مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا اس لیے میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

بالآخر میں مینار کے گنبد تک پہنچ گیا، مگر اس طرح سے کہ چچا جان میری قمیص کا کالر پکڑ کر مجھے کھینچ رہے تھے۔ "دیکھو۔" وہ بولے "غور سے دیکھو۔"

میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں تو اپنے سر پہ بادل ساکت دکھائی دیے جب کہ مینار، گنبد اور میں نے اپنے آپ کو تیزی سے گھومتا محسوس کیا۔ میرے ایک ہاتھ پر ہرے بھرے کھیت اور مکانات کا سلسلہ تھا جب کہ دوسرے پر جھلملاتا ہوا سمندر۔ سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

پروفیسر چاہتے تھے کہ میں سیدھا کھڑا رہوں اور چاروں طرف دیکھوں۔ یہ میرا پہلا سبق تھا جو ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ پھر جب انھوں نے مجھے نیچے اترنے کی اجازت دی تو میں کسی نہ کسی طرح سے نیچے پہنچا۔ اس وقت میں مشکل ہی سے کھڑا ہو پا رہا تھا۔

"کل ہم یہ مشق دوبارہ کریں گے۔" پروفیسر نے کہا۔

ہم اس مینار پر پانچ دن تک چڑھنے اور اترنے کی مشق کرتے رہے۔ اس سے میرے حوصلے اور ہمت میں خاصا اضافہ ہو گیا۔

بالآخر 2 جون کی صبح آ پہنچی۔ اس وقت تک ہم نے رکیاوک کی مشہور شخصیتوں کے نام تعارفی خطوط حاصل کر لیے تھے جن میں آئس لینڈ کا گورنر بھی شامل تھا۔ اس صبح ہمارا سامان والکائر نامی جہاز پر چڑھا دیا گیا۔ چند منٹ بعد جہاز نے ساحل چھوڑ دیا اور کھلے سمندر میں تیرنے لگا۔ پھر ایک گھنٹے بعد وہ سویڈن اور ڈنمارک کی آبنائے میں داخل ہو چکا تھا۔

"ہم کب تک اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے؟" چچا جان نے کپتان سے پوچھا۔

"اگر ہمیں کسی طوفان کا سامنا نہ کرنا پڑا تو دس دن لگیں گے۔" کپتان نے جواب دیا۔

"ہمیں تاخیر تو نہیں ہو جائے گی؟"

"پروا نہ کرو پروفیسر ہم صحیح وقت پر پہنچ جائیں گے۔"

شام تک جہاز ڈنمارک کے شمالی حصے کی طرف تھا اور رات کے وقت ناروے کے جنوبی حصے تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے بعد وہ شمالی سمندر میں داخل ہوا۔ دو دن بعد ہمیں اسکاٹ لینڈ

نظر آیا پھر ہم بحر اوقیانوس میں پہنچ گئے۔ میں اپنے کیبن میں آرام سے تھا مگر چچا جان جو شروع سے ہیجان میں مبتلا تھے اور جنھیں چاہیے تھا کہ وہ کپتان سے آئس لینڈ کے بارے میں معلومات حاصل کرلیں، اپنے کیبن میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔

11 جون کو ہمارا جہاز کیپ پورٹ لینڈ کے قریب سے گزرا، پھر 13 جون کو رکیاوک کے نزدیک خلیج میں لنگر انداز ہو گیا۔ پروفیسر اپنے کیبن سے نکل آئے۔ ان کا چہرہ زرد تھا اور اس پر ہمیشہ کی طرح فکر و تردد کے سایے تھے۔ وہ مجھے گھسیٹ کر آگے لے گئے اور انھوں نے ایک پہاڑ کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا اور چیخنے لگے ''سینی فلز..... سینی فلز۔''

جہاز ٹھہر چکا تھا اس لیے ہم ایک کشتی میں بیٹھ کر ساحل پر پہنچ گئے اور ہم نے آئس لینڈ کی سرزمین پر قدم رکھا۔ سب سے پہلے ہمیں گورنر دکھائی دیا۔ پروفیسر نے اسے وہ خط دیا جو وہ کوپن ہیگن سے لائے تھے۔ گورنر نے خط پڑھا اور ہماری مدد کرنے کی ہامی بھری۔ وہ رکیاوک کے میئر اور رکیاوک اسکول کے ایک سائنس کے استاد مسٹر ڈکسن نے چچا جان کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ پھر وہ ہمیں ٹھہرانے کے لیے اپنے گھر لے گئے۔

''البرٹ پریشانی ختم ہو گئی۔'' چچا جان نے مجھ سے کہا۔

''ختم ہو گئی؟'' میں نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں، کیوں نہیں۔ سفر ختم ہو گیا اور بس اب ہمیں زمین کی تہہ میں جانا ہے۔''

''لیکن جب ہم نیچے جائیں گے تو ہمیں واپس اوپر بھی تو آنا ہوگا؟''

''اوہ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔''

پروفیسر لائبریری میں چلے گئے تا کہ آرنی کے بارے میں لکھی ہوئی کوئی کتاب پڑھ سکیں جبکہ میں قصبے کی طرف گھومنے نکل گیا۔ رکیاوک میں دو ہی سڑکیں تھیں اور میں انھی پر چل رہا تھا۔ اس لیے میں راستہ نہیں بھول سکتا تھا۔ تین گھنٹوں میں میں نے وہاں کی تمام چیزیں دیکھ لیں۔ قصبہ اور گردونواح کا سارا علاقہ میں نے گھوم کر دیکھ لیا۔ وہاں زیادہ تر آتش فشاں پہاڑوں کا لاوا یا ان کی خالی چٹانیں تھیں، جن پر کوئی درخت یا جھاڑی نہیں تھی۔ گھاس پھوس اور مٹی سے بنی ہوئی کچھ جھونپڑیاں بھی نظر آئیں۔ وہاں کے بازار میں لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو مچھلیوں کی خرید و فروخت کر رہے تھے۔ مرد طاقتور اور توانا تھے، مگر بدوضع اور بدمزاج۔ مسکراہٹ سے ناآشنا۔ ساری دنیا سے کٹے ہوئے اس برفانی خطے میں قیام پذیر۔ وہاں کی عورتیں دل کش تھیں، مگر ان کے چہروں سے افسردگی جھلکتی تھی۔ مردوں کی طرح انھوں نے بھی سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔

میں مسٹر ڈکسن کے گھر لوٹ آیا جہاں میں نے انھیں اور چچا جان کو ساتھ بیٹھے دیکھا۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا اس لیے ہم تینوں ڈائننگ ہال میں چلے گئے۔ چچا جان نے سیر ہو کر کھایا۔ کھانے کے دوران گفتگو ہوتی رہی۔ وہ صرف آئس لینڈ کی زبان میں گفتگو کرتے رہتے تو میری سمجھ میں کچھ نہ آتا لیکن ڈکسن لاطینی اور چچا جان جرمنی زبان کے الفاظ بھی استعمال کر رہے تھے۔ اس لیے میری سمجھ میں بھی کچھ نہ کچھ آرہا تھا۔

''تم میری لائبریری میں کیسی کتابیں تلاش کر رہے ہو؟ مجھے بتاؤ تا کہ میں تمھاری مدد کرسکوں؟'' ڈکسن نے چچا سے پوچھا۔

میں نے چچا جان کی طرف دیکھا۔ وہ جواب دیتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ بالآخر انھوں نے کہا ''مسٹر ڈکسن میں آرنی کی کتابیں پڑھنا چاہتا ہوں۔''

"آرنی!" رکیاوک کے استاد نے دہرایا۔ "تمھارا مطلب ہے سولھویں صدی کا کیمیا داں جو سیاح بھی تھا؟"

"یقیناً"

"اس کی کتابیں ادب اور سائنس کے طالب علموں کے لیے سرمایہ ہیں۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم اس سے اچھی طرح واقف ہو، مگر میں اس کی کتابوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"ہمارے پاس اس کی کتابیں نہیں ہیں۔"

"یہاں آئس لینڈ میں بھی نہیں ہیں۔"

"آئس لینڈ میں نہیں ہیں اور دنیا کے کسی خطے میں بھی ان کے ملنے کا امکان نہیں ہے۔"

"ایسا کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ وہ منکرِ خدا تھا اور چرچ کی تعلیمات کو تسلیم نہیں کرتا تھا چنانچہ 1573 میں اس کی کتابیں کوپن ہیگن میں جلا دی گئیں۔"

"اوہ میں سمجھ گیا کہ آرنی نے اپنی باتوں کو راز میں کیوں رکھا تھا۔"

"کیسا راز" مسٹر ڈکسن چونک پڑے۔

"ایک راز...... جو...... جو کہ......"

"کیا تمھارے پاس آرنی کے خفیہ کاغذات ہیں؟"

"نہیں... مم... نہیں... میں تو اندازہ قائم کر رہا تھا۔" چچا جھوٹ بولتے ہوئے ہچکچائے۔

"اوہ اچھا۔" ڈکسن نے کہا اور موضوع تبدیل کر دیا۔ مجھے امید ہے کہ تم آئس لینڈ کی معدنی دولت دیکھے بغیر نہیں جاؤ گے؟"

"یقیناً نہیں۔" چچا جان نے جواب دیا۔ "مگر مجھے

اندازہ ہو رہا ہے کہ مجھ سے پہلے بھی یہاں دوسرے سائنس داں آچکے ہیں۔"

"ہاں آچکے ہیں۔ پروفیسر بروک لیکن ابھی یہاں بہت کچھ ہونا باقی ہے۔"

"تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا ہے؟" چچا نے معصومیت سے کہا۔

"اوہ یہاں بہت سے پہاڑ آتش فشاں اور گلیشیئر ایسے ہیں جن کے بارے میں معلومات حاصل کی جانا باقی ہیں۔ مثال کے طور پر اس پہاڑ کی طرف دیکھو، وہ سینی فلز ہے۔

"آہ سینی فلز۔"

"کیا وہ آتش فشانی نہیں کرتا ہے؟"

"وہ پانچ سو سال سے خاموش ہے۔"

"اچھا، ہوں۔" چچا جان بولے اور انھوں نے اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں اس اندیشے کے تحت کہ کہیں وہ فضا میں چھلانگ نہ لگا بیٹھیں۔ "میرا خیال ہے کہ میں اپنے مطالعے اور مشاہدے کا آغاز اس سے کروں۔ سیسی فل...... فیسل...... کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

"سینی فلز" مسٹر ڈکسن نے دہرایا۔

یہ باتیں چونکہ لاطینی میں ہو رہی تھیں اس لیے میری سمجھ میں آرہی تھیں۔ چچا جان اپنی خوشی چھپانے کی جو کوشش کر رہے تھے اس پر مجھے ہنسی آرہی تھی۔

"تمھاری باتوں سے میرے ذہن میں ایک منصوبہ پرورش پا رہا ہے کہ ہمیں اس پہاڑ پر چڑھنے اور اس کا دہانہ دیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔" انھوں نے اسکول ماسٹر سے کہا۔

"معاف کرنا اس سفر میں، میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکتا۔" مسٹر ڈکسن نے معذرت چاہی۔

"اچھا خیر۔" چچا جان نے فوراً کہا۔ "تمھارا شکریہ۔ مگر ہم تمھیں زحمت نہیں دینا چاہتے۔"

"تم سینی فلز تک کیسے جاؤ گے؟" ہمارے میزبان نے پوچھا۔

"ہم کشتی کے ذریعے خلیج کو پار کریں گے۔ میرے خیال میں یہی سب سے چھوٹا راستہ ہے!"

"یہ ممکن نہیں ہے۔ رکیاوک میں تمھیں کوئی ایسی کشتی نہیں ملے گی۔ تم کو زمین پر سفر کرنا پڑے گا، اس لیے ساحل کے کنارے کنارے چلتے ہوئے وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرو۔"

"ٹھیک ہے، میں کسی گائڈ کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"میں ایک اچھے، مستقل مزاج اور شکاری شخص کا نام اس سلسلے میں تجویز کر سکتا ہوں۔ وہ سینی فلز کے نزدیک ہی رہتا ہے۔ ڈنمارک کی زبان اچھی طرح سے بول سکتا ہے۔"

"اس سے کب ملاقات ہو سکتی ہے؟" چچا نے اشتیاق ظاہر کیا۔

"اگر تم چاہتے ہو تو کل ہی ہو سکتا ہے۔"

"آج کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ وہ کل سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔"

"ٹھیک ہے کل سہی۔" چچا نے مایوسی سے گہری سانس لے کر کہا۔

■

(جاری)

ماخذ: زمین کی تہہ میں (جولز ورنے کے ناول کا ترجمہ)، مترجم: شکیل صدیقی، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اشتراک: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

بڑے لوگ بڑی باتیں

ارسطو

غصہ ہمیشہ حماقت سے شروع ہوکر ندامت پر ختم ہوتا ہے۔

جو بات معلوم ہو اس کو بتانے میں شرم نہ کر۔

کسی بات سے ناامید مت ہو کہ اس سے عمر گھٹ جاتی ہے۔

انسان کے اسباب ظاہری میں عزت کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔

زندگی کی سب سے بڑی فتح نفس پر فتح پانا ہے۔

لگن کے بغیر کسی میں بھی ذہانت پیدا نہیں ہوتی۔

دوستی جتنی پرانی ہو اتنی ہی عمدہ اور مضبوط ہوتی ہے۔

اگر کوئی تیرے حق میں بدی کرے یا تو کسی سے نیکی کرے تو دونوں کو بھول جا۔

جو شخص حصول علم کی مشکلات نہیں جھیلتا، اسے جہالت کی سختیاں عمر بھر جھیلنا پڑتی ہیں۔

شر کو شر سے رفع کرنا اگرچہ صحیح بات ہے مگر شر کو خیر سے رفع کرنا نسبتاً احسن ہے۔

مصیبتیں اور دکھ ہمیں کم ہمتی کی وجہ سے خوفناک نظر آتے ہیں۔

عورت کی ترقی یا تنزلی پر قوم کی ترقی یا تنزلی کا انحصار ہوتا ہے۔

اپنے ملازم سے راز کہنا اسے مالک بنانے کے مترادف ہے۔

سب سے آسان اور اچھا فائدہ مند کام کم بولنا ہے۔

کارہائے گذشتہ پر افسوس نہ کر، ورنہ تمہیں اور افسوس کا سامنا کرنا پڑے گا۔

سخاوت اسے کہتے ہیں کہ حاجت مندوں کو ان کی ضرورت کے مطابق دیں۔ اس سے بڑھ کر افراط کی حد تک پہنچنا سخاوت نہیں بلکہ اسراف میں داخل ہے۔

اپنے اعضا کو محنت و مشقت کا عادی بنا۔ ہر چند کہ خدمت گار موجود ہوں۔ حوادث زمانہ میں اگر وہ نہ رہے تو بے دست و پا ہو جاؤ گے۔

بخیل خواہ دولت مند ہو رسوا ہوگا اور سخی چاہے غریب ہو عزت دار ہوگا۔

ترقی کی منازل طے کرنے میں دیر لگتی ہے، جب کہ پستی میں دیر نہیں لگتی۔ جیسے ایک پتھر نیچے کو تیز آتا ہے۔

جواب دینے میں جلدی نہ کرو، تاکہ بعد میں شرمندگی نہ ہو۔

زیادہ باتونی شخص پڑھنے پر کم توجہ دیتا ہے۔

اگر تم گناہ پر آمادہ ہو جاؤ تو کسی ایسی جگہ کو تلاش کرو جہاں خدا نہ ہو۔

جس شخص نے اپنی زبان اور اپنے نفس کو قابو میں رکھا۔ اس نے گویا سیکڑوں آدمیوں کو اپنے بس میں کر لیا۔

انقلاب چھوٹی چھوٹی باتوں سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔

کامیابی کا زینہ ناکامیوں کی بہت سی سیڑھیوں سے مل کر بنتا ہے۔

وقت ضائع کرتے وقت اس بات کو ذہن میں رکھو کہ وہ بھی تمہیں ضائع کر رہا ہے۔

جاہل عالم کو نہیں جانتا، کیونکہ وہ کبھی عالم نہیں رہا لیکن عالم جاہل کو جانتا ہے کیونکہ وہ خود جاہل رہ چکا ہے۔

سقراط

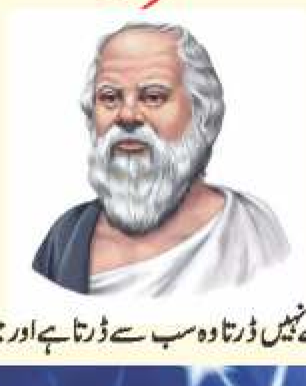

جو خدا سے نہیں ڈرتا وہ سب سے ڈرتا ہے اور جو خدا سے ڈرتا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔

لوہا صرف لڑائی کے وقت سونے سے بہتر سمجھا جاتا ہے مگر عقل ہر جگہ اور ہر وقت سونے سے زیادہ قیمتی ہے۔

نامعلوم اور پیچیدہ راستوں کی کوتاہی پر فریفتہ مت ہو اور سیدھے راستوں کی درازی سے اندیشہ مت کر۔

نیک بات کے تسلیم کرنے میں صرف اس خیال سے کہ اس کے کہنے والا ایک حقیر آدمی ہے شرم نہ کرنی چاہیے۔

اگر ہم اپنی مصیبتوں کا تبادلہ کر سکتے تو ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو غنیمت جانتا۔

جب انسان کسی کے ساتھ کسی طرح کی نیکی نہ کر سکے تو اس کی برائیوں ہی سے اسے مطلع کرتا رہے۔

دوستی کی شیرینی کو ایک دفعہ کی رنجش کی یاد ہمیشہ زہر آلود کرتی رہتی ہے۔

جس چیز کا علم نہیں اس کے بارے میں کچھ مت کہو۔

جس چیز کی ضرورت نہیں اس کی جستجو مت کرو۔

جن کی ضروریات کم ہوتی ہیں وہ خدا کے نزدیک ہوتے ہیں۔

کھانے کے لیے زندہ نہ رہو بلکہ زندہ رہنے کے لیے کھاؤ۔

وہ گھر جس میں کتابیں نہیں اس جسم کی مانند ہے جس میں روح نہ ہو۔

اعلیٰ ظرف انسان کی شناخت یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرے۔

نپولین بوناپارٹ

میں جنگ ہار سکتا ہوں لیکن وقت ضائع نہیں کر سکتا۔

جنگ میں اخلاقی قوتیں تین چوتھائی اہمیت رکھتی ہیں،

مادی قوت کا رول صرف ایک چوتھائی ہے۔

تم مجھے بہترین مائیں دو میں تمھیں بہترین قوم دوں گا۔

اتحاد جنگ کا سب سے مہلک ہتھیار ہے۔

ناممکن کا لفظ میری لغت میں نہیں۔

آپ خوش ہیں یا ناخوش، تکلیف اور مصیبت سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آپ مصروف رہیں۔

جو یہ سوچ کر لڑے کہ میں ہار جاؤں گا تو وہ ضرور ہار جائے گا۔

میں اپنے حریفوں پر اس لیے غالب آتا ہوں کہ وہ چند لمحوں کو عموماً کچھ نہیں سمجھتے، میں ان لمحوں کی قدر و قیمت کو خوب سمجھتا ہوں۔

لیوٹالسٹائی

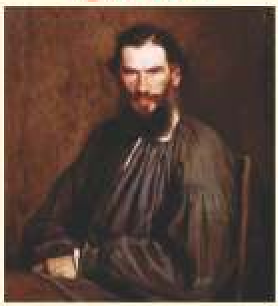

کردار انسان کا آئینہ ہے۔

بری کتابیں ایسا زہر ہیں جو جسم کو نہیں روح کو مار دیتی ہیں۔

چاپلوس اس لیے آپ کی چاپلوسی کرتا ہے کہ وہ آپ کو بیوقوف سمجھتا ہے۔ جبکہ آپ یہ سن کر خوش ہوتے ہیں۔

اعتماد زندگی کی متحرک قوت ہے۔

ہر خوشحال گھرانہ دوسرے خوشحال گھرانوں سے لطف اندوزی حاصل کرتا ہے جبکہ غریب گھرانے اپنی ہی غربت کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔

برنارڈشا

اپنی صحت وتندرستی کے لیے شام کو فٹ بال، ٹینس اور پولو کھیلنے والو! تم دیہاتوں میں جا کر ان غریب کسانوں کا ہاتھ

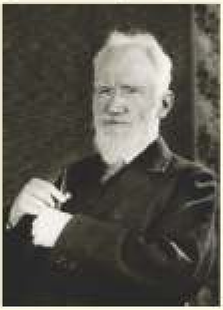

کیوں نہیں بٹاتے، جن کے جسم محنت کی زیادتی سے چور چور ہو رہے ہیں۔

جو شخص اچھی کتابیں پڑھنے کا شوق نہیں رکھتا، وہ معراج انسانی سے گرا ہوا ہے۔

خاموشی اظہارِ نفرت کا سب سے بہتر طریقہ ہے۔

زندگی ایک ایسا ہیرا ہے جسے تراشنا انسان کا کام ہے۔

چاند کے بغیر رات بے کار ہے اور علم کے بغیر ذہن۔

خاموش اور کم گو آدمی کا ہر جگہ استقبال ہوتا ہے۔

■

بشکریہ: اقوال زریں، اقبال سائبر لائبریری نیٹ

جنید عبدالقیوم شیخ

ابن الہیثم: بابائے جدید بصریات

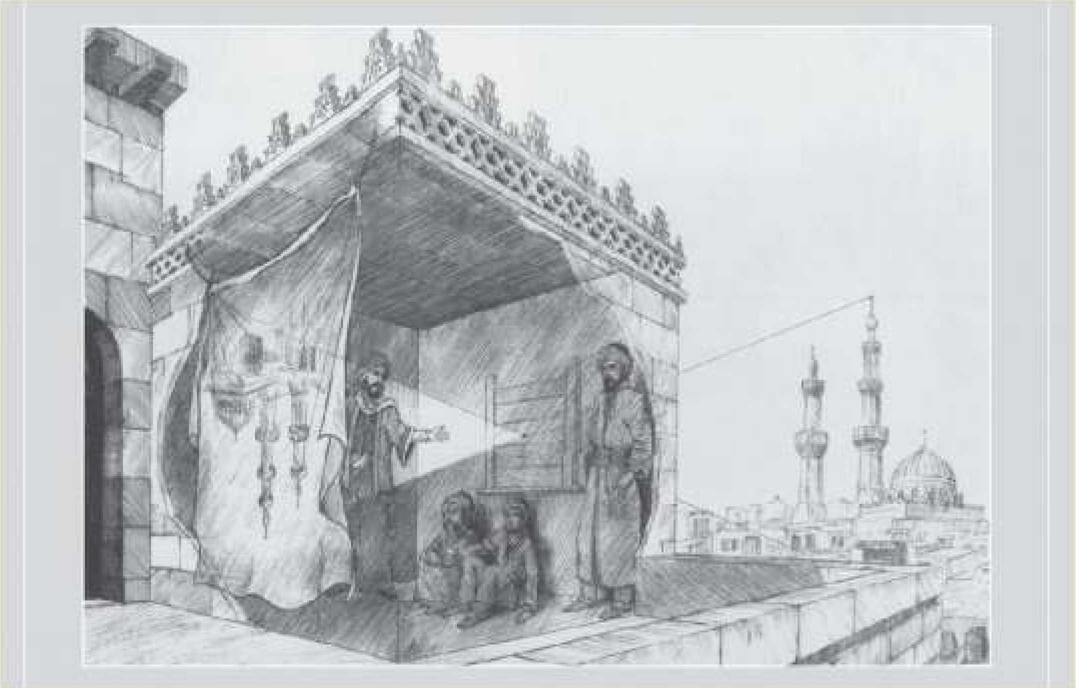

پیارے بچو! آج کل IPL کھیلوں اور دوسری تقریب میں بیٹھے لوگوں کے کیمرے فوراً چلنا شروع ہو جاتے ہیں اور لوگ اس یادگار پروگرام کا ایک ایک لمحہ اپنے کیمرے میں محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ کون جانتا تھا کہ ایک مسلمان سائنس داں کے ایجاد کردہ کیمرے کی مدد سے آج ہزار سال بعد لوگ یہ حیرت انگیز مناظر محفوظ کرنے کے قابل ہوں گے۔

جی ہاں! کیمرہ عظیم مسلمان سائنس داں ابن الہیثم (Al-hazen) نے آج سے تقریباً ہزار سال پہلے ایجاد کیا تھا۔ کیمرہ ایجاد کرنے کے لیے ابن الہیثم نے ایک نہایت ہی کامیاب تجربہ کیا۔

ابن ابن الہیثم کی تصویر

ابن ابن الہیثم نے تجربات کے ذریعے ثابت کیا کہ اگر کسی تاریک کمرے کی دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ سورج کے رخ پر ہو اور اس سوراخ کے دوسری طرف کمرے میں ایک پردہ اس طرح ہو کہ باہر کی روشنی کا عکس اس پردے پر پڑے تو پردے پر جن اشیا کا عکس بنے گا وہ الٹا نظر آئے گا۔ اس کو کیمرہ آبسکیورہ (Camera Obscura) کہا جاتا ہے۔ صدیوں بعد فوٹو لینے والا کیمرہ اسی سائنسی اصول کے پیش نظر بنایا گیا۔

اس لیے یہ کہنے میں حرج نہیں کہ کیمرے کا موجد ابن الہیثم ہے... تصویر۔

سچ پوچھیے تو ابن الہیثم کے کارناموں کو ایک کیمرے کی ایجاد تک محدود کر دینا شاید ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی کیونکہ انھوں نے بصریات، نور کی ترسیل، غروب آفتاب کے رنگوں کے متعلق، قوس قزح، انعطاف اور انعکاس نور، سایہ گہن اور نور کے متعلق جدید ترین معلومات سے دنیا کو واقف کروایا۔ آج دنیا اس سائنس داں کو بابائے جدید بصریات کے نام سے جانتی ہے۔ ان کی سب سے اہم دریافتوں میں آنکھ کی مکمل تشریح بھی ہے انھوں نے آنکھ کے ہر حصہ کے کام کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ جس میں آج کی جدید سائنس بھی رتی برابر تبدیلی نہیں کر سکتی۔

الہیثم نے سمجھایا کہ رات میں تارے کیوں جھلملاتے ہیں؟ شیشے پر روشنی پڑتی ہے تو اس کا یہ نقطۂ ماسکہ کیا ہے؟ انسان کو ایک کی بجائے دو آنکھیں کیوں ہیں؟ انھوں نے اپنی کتاب 'میزان الحکمت' میں کثافت کے موضوع پر جدید ترین انکشافات کیے۔ انھوں نے دو سو کتابیں تصنیف کی۔ جس میں 'المناظر' کتاب زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ سائنس داں جارج سارٹن نے الہیثم کے سلسلے سے کہا کہ الہیثم کی کتاب المناظر کے لاطینی ترجمے نے مغربی سائنس پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ راجر بیکن اور کیپلر نامی سائنسداں بھی اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔

■

Junaid A. Shaikh(Teacher)
S.S.A. Urdu High School &
Jr. College of Science Solapur - Maharashtra

اقوال زرّیں

* خود پر قابو پالو حالات پر بھی قابو حاصل ہو جائے گا۔
* غصہ ہمیشہ حماقت سے شروع ہوتا ہے اور ندامت پر ختم ہوتا ہے۔
* اپنے آپ کو سب سے بہتر سمجھ لینا جہالت ہے۔
* سب سے بہادر شخص وہ ہے جو غصہ پی جائے۔
* خوشی اُس انسان کو حاصل ہوتی ہے جو اپنی خواہشات پر قابو رکھے۔

■

Ronaq Bee Malik Sattar
Class: VII, Al-Hasnat High School, Rusulpur Rhweer, Jalgaon (Maharashtra)

شمائلہ ارم محمد اعجاز

اقوال زرّیں

1۔ بھروسہ ایک ایسا تحفہ ہے جو دولت دیکھ کر نہیں بلکہ قابلیت دیکھ کر دیا جاتا ہے۔
2۔ کسی کو دھوکہ مت دو کیونکہ دھوکہ جس سے شروع ہوتا ہے اُسی پر ختم ہوتا ہے۔
3۔ عقلمند کو نصیحت کی ضرورت نہیں ہوتی اور بیوقوف اُسے قبول نہیں کرتا۔
4۔ خوبصورت ہونا اہم نہیں ہے بلکہ اہم ہونا خوبصورت ہے۔
5۔ زندگی کی کتاب میں اتنی غلطیاں مت کرو کہ پینسل سے پہلے ربر ختم ہو جائے، توبہ سے پہلے زندگی۔

■

Shumaila Iram Mohd Ajaz
G.N. Azad Urdu High School
Wadegaon. Tq.: Balapur
Distt.: Akola - 444502 (Maharashtra)

آؤ اردو سیکھیں

بچو! امید ہے کہ آپ تمام شمارے جمع کرتے جا رہے ہوں گے اور تھوڑا تھوڑا کر کے اردو پڑھنے اور لکھنے کا سلسلہ بھی جاری ہوگا۔ اس شمارہ میں چار حروف اور ان سے بننے والے الفاظ سیکھتے ہیں۔

बच्चो! उम्मीद है कि आप तमाम शुमारे जमा करते जा रहे होंगे और थोड़ा थोड़ा करके उर्दू पढ़ने और लिखने का सिलसिला भी जारी होगा। इस शुमारा में चार हुरूफ़ और उनसे बनने वाले अलफ़ाज़ सीखते हैं–

ج چ ح خ

जीम (ج) चे (چ) हे (ح) ख़े (خ)

ج سے جنگل؛ جانماز؛ جامن؛ جلوس؛ جراب

जीम(ج)से जंगल; जानमाज़; जामुन; जुलूस; जुराब

چ سے چاند؛ چادر؛ چرخہ؛ چاقو؛ چقندر

चे (چ) से चाँद; चादर; चरखा; चाकू; चुकंदर;

ح سے حلوا؛ حقہ؛ حاجی؛ حجاب؛ حمام

हे (ح) से हलवा; हुक़्क़ा; हाजी; हिजाब; हम्माम

خ سے خربوزہ؛ خرگوش؛ خط؛ خلال؛ خیمہ

ख़े (خ) से ख़रबूज़ा; ख़रगोश; ख़त; खिलाल; ख़ेमा

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کر لیں تو سمجھیے کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

جوابات اگلے شمارے میں تلاش کریں

ندا پروین محمد انیس

رسی کے نشان

راجو نام کا ایک لڑکا تھا۔ اس کے ماں باپ پڑھے لکھے اور بہت اچھے تھے۔ اس کی بہن مینا بھی سمجھ دار اور پڑھائی میں ہوشیار تھی۔ لیکن راجو کو کھیل کود اور شرارتوں کے سوا کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ کلاس میں سب لڑکے دھیان سے پڑھتے تھے لیکن راجو کھڑکی سے باہر کے نظارے دیکھنے میں کھویا رہتا تھا۔ پڑھائی میں اس کا من ہی نہیں لگتا تھا۔

پڑھائی کو لے کر لاپروائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ کلاس میں راجو بری طرح ناکام ہوگیا۔ گھر میں اس کا رزلٹ دیکھ کر اس کے ماں باپ بہت ناراض ہوئے اور انھوں نے راجو کو بہت ڈانٹ پھٹکار لگائی۔ اس سے دکھی ہو کر راجو نے گھر چھوڑ دیا اور کہیں دور چلے جانے کا فیصلہ کیا۔

راجو چلتا جارہا تھا۔ راستے میں اس نے ایک کنواں دیکھا۔ کچھ عورتیں کنویں پر پانی بھر رہی تھیں۔ راجو کو پیاس لگی تھی۔ اس نے مانگ کر پانی پیا۔ اچانک اس کا دھیان کنویں کی اوپر کی دیوار پر بنے نشانوں کی طرف گیا۔ اس نے ایک عورت سے پوچھا ”ماں جی یہ نشان کس کے ہیں؟“ اس عورت نے بتایا ”بیٹا یہ نشان رسی کے گھسنے سے بنے ہیں۔ رسی سے کنوئیں سے پانی نکالتے ہیں۔ رسی کے بار بار گھسنے سے یہ نشان بنے ہیں۔“ اس عورت کی بات سن کر راجو کے دماغ میں ایک بجلی سی کوند پڑی اس نے سوچا کہ جب رسی کے بار بار گھسنے سے پتھر پر نشان بن سکتے ہیں تو بار بار یاد کرنے سے مجھے بھی سبق یاد ہوسکتا ہے۔ ایسا سوچ کر راجو گھر لوٹا اور لگن سے پڑھائی کرنے لگا۔ راجو میں آیا یہ بدلاؤ دیکھ کر اس کے ماں باپ کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

راجو سالانہ امتحان میں پہلے نمبر سے کامیاب ہوا۔

■

Neda Parveen Mohd Anis
Lodhayo Jin, Pachora
(Dist Jalgaon) - 424201 (Maharashtra)

عمرہ تجاروی

جادوئی گھڑا

ایک گاؤں میں ناہر سنگھ نام کا ایماندار اور محنتی کسان رہتا تھا وہ روز صبح سویرے اٹھتا اور اپنے حل بیل یا پھاوڑا کھرپی لے کر اپنے کھیت پر پہنچ جاتا اور محنت اور لگن سے کھیتی باڑی کا کام انجام دیتا جس سے اس کا اور اس کے بیوی بچوں کا تنگی ترشی سے گزر ہو رہا تھا۔

ایک مرتبہ کام کے دوران اس کا پھاوڑا کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا مٹی ہٹانے پر ایک اچھی حالت کا قابلِ استعمال گھڑا نکلا دوپہر میں کسان آرام کرنے اور کھانا کھانے کے لیے ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور اپنا پھاوڑا لاپرواہی سے دریافت شدہ گھڑے کے اندر کھڑا کر دیا تھوڑی دیر میں کسان کی نظر گھڑے پر پڑی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا گھڑے میں ایک کے بجائے سو پھاوڑے ترتیب سے رکھے تھے اسے شبہ ہوا کہ گھڑا جادوئی ہے اس نے اپنا وہم دور کرنے کے لیے ایک پتھر گھڑے میں ڈالا چند لمحے کے بعد گھڑے میں سو پتھر تھے اب کسان کو یقین ہو گیا کہ گھڑا جادوئی ہے اس نے احتیاط سے گھڑے کو گھر پہنچایا اور ایک بڑی الماری میں رکھ دیا اور اپنی اور اپنے خاندان کی ضروریات کے لیے اس کا استعمال کرنے لگا، اس کے پڑوسیوں کو اس کی بدلتی ہوئی حالت نے تجسس میں مبتلا کر دیا تھا، ایک دن اس کے ایک پڑوسی نے اسے الماری میں سے گھڑا نکالتے اور اس سے کوئی چیز حاصل کرتے دیکھ لیا، پڑوسی بڑا لالچی تھا اس نے دوسری ہی رات گھڑا چرا لیا اور اس کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھنے لگا کہ اس میں کیا ہے ہاتھ باہر نکالا تو ایک نہیں سو تھے وہ بہت پریشان ہوا لیکن کیا کر سکتا تھا چند دن گھر میں چھپا رہا آخر کب تک بالآخر باہر نکلا، لوگوں نے جب یہ عجیب منظر دیکھا تو سب نے لاٹھی ڈنڈوں سے خوب خاطر تواضع کی گھڑے کے مالک کو جب پتہ چلا تو وہ دوڑا ہوا آیا اور لوگوں کو سمجھا بجھا کر الگ ہٹایا، گھڑے کے چور نے اپنی غلطی کی معافی مانگی اور اسے اس کے مالک کو واپس دے دیا۔■

Umra Tujjarvi
Class: 9
AMU City, Girls High School, Aligarh

ہنسی کے غبارے

ایک چور کسی مکان میں چوری کے لیے گھسا۔ اتفاق سے وہ کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ مکان مالک جاگ گیا۔ اس نے پوچھا کون ہے؟ چور نے منہ سے بلی کی آواز نکالی....

میاؤں... میاؤں

مکان مالک سو گیا۔ کچھ دیر بعد چور پھر کسی چیز سے ٹکرا گیا مالک مکان کی پھر آنکھ کھل گئی۔ اس نے پوچھا کون ہے؟''

چور نے بلی کی آواز نکالی ''میاؤں..... میاؤں'' مالک کو شک ہو گیا۔ جب اس نے تیسری بار غصے سے پوچھا کہ کون ہے، تو چور جھلا کر بولا ''سنائی نہیں دیتا بلی ہے!''

شام کے وقت پارک میں دو عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اتنے میں ایک بچہ سائیکل پر تیزی سے گزرا اور بولا ''مما مما! دیکھیں میں ایک ہاتھ کے بغیر سائیکل چلا رہا ہوں'' تھوڑی دیر بعد بچہ پھر گزرا ''مما! دیکھیں میں دو ہاتھوں کے بغیر سائیکل چلا رہا ہوں۔'' تیسری بار بچہ آیا اور روتے ہوئے بولا۔

''مما مما! دیکھیں میں دو دانتوں کے بغیر سائیکل چلا رہا ہوں۔''

ایک پروفیسر صاحب اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے گھر پہنچے اور کافی دیر تک اس کے ساتھ گپ شپ کرتے رہے۔ کھانے کا وقت ہوا تو انھوں نے وہیں کھانا بھی ایک ساتھ کھا لیا۔ پھر شطرنج کی بساط بچھ گئی۔ کئی گھنٹے بعد جب پروفیسر رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر دوست نے رسماً پوچھا۔

''گھر پر تو سب خیریت ہے نا؟''

پروفیسر نے چونک کر جواب دیا ''خوب یاد دلایا تم نے۔ دراصل میں تمھارے پاس اس لیے آیا تھا کہ میری بیوی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔''

تین پروفیسر ریلوے اسٹیشن پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ وہ باتوں میں ایسے محو رہے کہ گاڑی آنے کی خبر تک نہ ہوئی، چند منٹ بعد گاڑی نے وسل دی تو وہ چونک گئے اور گھبرا کر ایک ڈبے کی طرف دوڑے۔ دو تو کسی طرح چڑھنے میں کامیاب ہو گئے لیکن تیسرے صاحب نہ چڑھ سکے۔

ایک قلی نے کہا ''کوئی بات نہیں صاحب، دوسری گاڑی سے چلے جانا۔

پروفیسر بولے وہ تو میں چلا ہی جاؤں گا مگر ان دونوں کا کیا ہوگا جو مجھے چھوڑنے آئے تھے۔''

بچوں کی دنیا

ننھے فنکار

ادیب قادری، درجہ سوم، اسکول: سوریہ اکیڈمی، دیوریا، یوپی

ثانیہ صدف شیخ انور، درجہ ہفتم، ضلع پریشد اسکول، کرکھیلی تعلقہ دھرم آباد، ضلع ناندیڑ، مہاراشٹر

سریا رحمان، صادق میموریل اسکول، درجہ: دہم

فرح ناز بانو، گورنمنٹ بی ایچ ایس، جموں وکشمیر

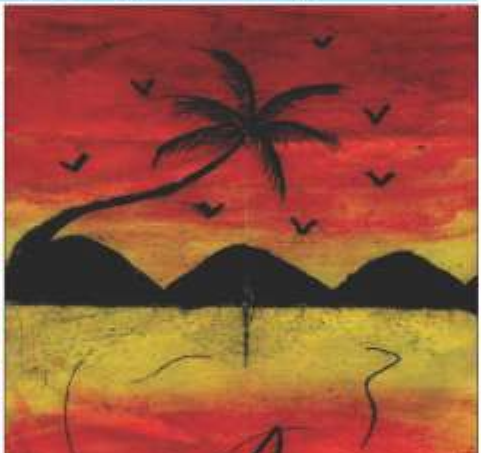

تنزیلہ کوثر شفیق احمد، درجہ پنجم، سوئس ہائی اسکول، مالیگاؤں، ضلع ناسک جون

مسرت شفی، درجہ: دہم، سلطانیہ اسکول

زبیر حدیث خان، درجہ ہشتم (الف)
رضوان حارث آئیڈیل ہائی اسکول، رابوڑی تھانہ

محمد عدنان ذکی محمد نعیم، درجہ پنجم، بدنیرہ، ضلع امراوتی، مہاراشٹر جولائی

عشمیرہ انم عطاء اللہ خان، درجہ چہارم، اکوٹ، ضلع اکولہ، مہاراشٹر جولائی

سامعہ انور، درجہ ایک

ریا گینگ وار، درجہ پنجم سیکشن بی، سنوے سینئر سیکنڈری اسکول، رامپور

مانی سنگھ، درجہ دہم، سنوے سینئر سیکنڈری اسکول، رامپور

اردو facebook فیس بک

'بچوں کی دنیا' ایسی خوبصورت دنیا ہے، جس کے مختلف قسم کے رنگوں میں ہم جیسے بچے اپنے روشن مستقبل کے خواب جاگتی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ دلچسپ مضامین، کہانیاں، نظمیں اور رنگ برنگی تصویریں دل کو خوب لبھاتی ہیں۔ فیس بک کالم، مجھے بہت پسند ہے۔ ہم ہر مہینے بچوں کی دنیا کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔

مرزا محمد ارسلان ساجد بیگ، انجمن اسلام اردو ہائی اسکول، جلگاؤں، مہاراشٹر

میں مالیگاؤں کے تہذیب ہائی اسکول کا طالب علم ہوں۔ مجھے اردو زبان بہت اچھی لگتی ہے۔ میرے اسکول میں بہت سے رسالے آتے ہیں میں 'بچوں کی دنیا' ہر مہینے خریدتا ہوں۔ مجھے قسط وار ناول، نظمیں اور کہانیاں، بہت اچھی لگتی ہیں۔

محمد اویس درجہ ہشتم، تہذیب ہائی اسکول، مالیگاؤں، مہاراشٹر

'بچوں کی دنیا' کا تازہ شمارہ دستیاب ہوا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ہر مضمون، نظمیں اور کہانیاں اپنی جگہ پر قابل تعریف ہیں۔

مسکان بی سید خالق، الحسنات اردو جونیئر کالج رسلپور، جلگاؤں، مہاراشٹر

میرا نام محمد صادق ہے۔ میں ساتویں کلاس میں پڑھتا ہوں۔ 'بچوں کی دنیا' مجھے بہت پسند ہے۔ خاص طور سے آپ کا دماغ کتنا تیز ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔

محمد صادق چاند پورہ، مئو، یوپی

ماہ فروری کا رسالہ ملا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ 'بچوں کی دنیا' کا کیا ہی کہنا دل چھو لیا۔ میں بچوں کی دنیا ایک سال سے پڑھ رہا ہوں۔ اس میں آنے والے مضامین، کہانیاں، لطیفے، ننھے فنکار، اچھے کالم ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو اور ترقی عطا فرمائے۔ آمین!

محمد یحیٰ درجہ 11، کنڈہ پرتاپ گڑھ

میرا نام عفیفہ عصمت ہے۔ میں گاؤں کے مدرسہ ربانیہ میں تعلیم حاصل کرتی ہوں۔ میں 'بچوں کی دنیا' ہر ماہ دل لگا کر پڑھتی ہوں، گھر میں بڑے بھی اس رسالے کی بے حد تعریف کرتے ہیں، ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اس رسالے میں ہر مہینے کچھ نیا ہی ہوتا ہے، لیکن آپ سے ایک گزارش ہے کہ 'ہم آواز الفاظ'، 'ضد الفاظ' اور مترادفات کو ہر ماہ شائع کیجیے، اس سے ہمارے علم میں بہت اضافہ ہوتا ہے۔

عفیفہ عصمت بنت سمیع الضحیٰ، مدرسہ ربانیہ امواء مدینۃ الشیخ پیراہی، شیوہر، بہار

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

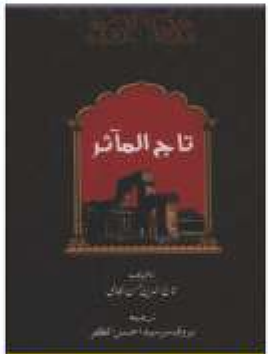

صفحات: 301، قیمت: 145 روپے

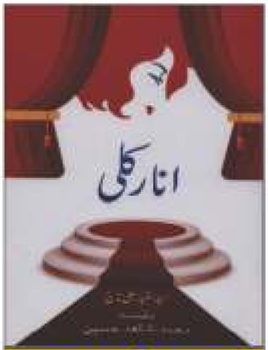

صفحات: 143، قیمت: 90 روپے

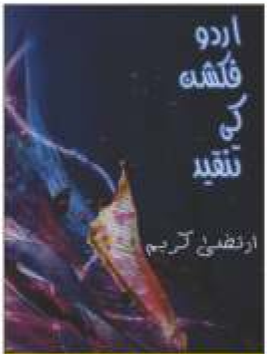

صفحات: 546، قیمت: 230 روپے

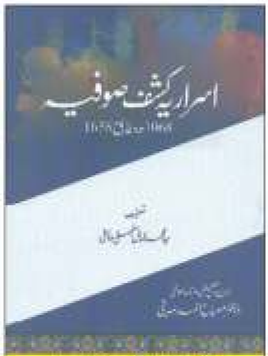

صفحات: 803، قیمت: 335 روپے

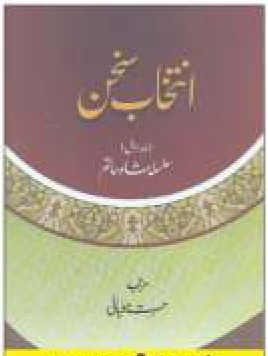

صفحات: 388، قیمت: 175 روپے

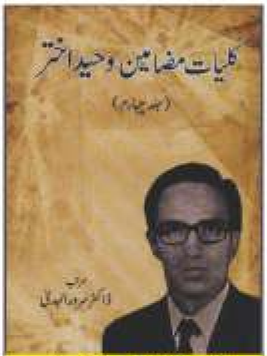

صفحات: 305، قیمت: 160 روپے

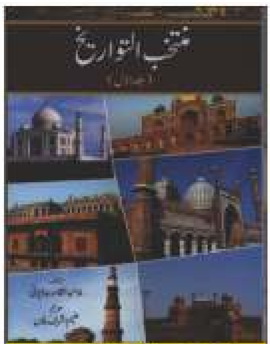

صفحات: 123، قیمت: 77 روپے

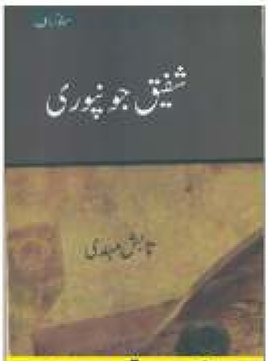

صفحات: 120، قیمت: 75 روپے

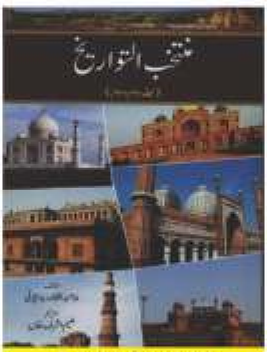

صفحات: 215، قیمت: 75 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 sales@ncpul.in, E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com

BACHON KI DUNIYA Monthly, August 2017, Vol. 05, Issue: 8
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439-2016-18
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/07/17
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

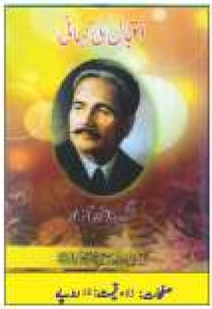
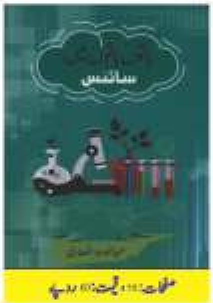
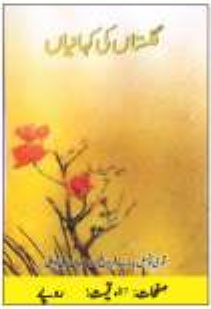
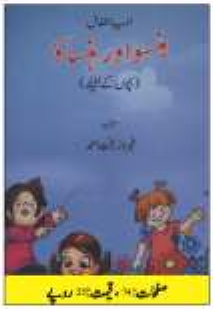
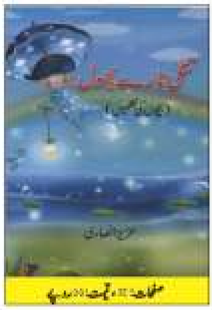

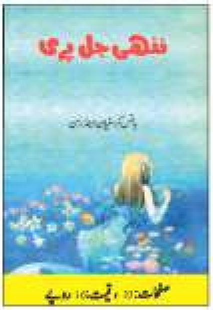
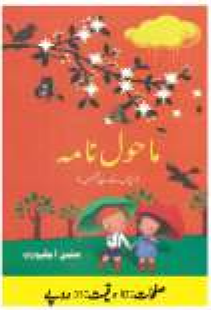

خریداری کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.